کاغزل

حریم کے سالنامہ ۱۹۷۳ء کے لئے

عفت موہانی

◎

بااہتمام

نسیم بک ڈپو - ۲۵ - لاٹوش روڈ لکھنؤ

ٹیلیفون { آفس :- ۲۴۵۵۹
رہائش :- ۲۵۳۳۴

ناشر: عزیز الرحمٰن (بار اوّل جنوری ۱۹۶۲ء) پرنٹر: سرفراز قومی پریس لکھنؤ

ٹرین ایک جنکشن پر رُکی ۔ عائشہ نے دیکھا کہ بک اسٹال کے پاس وہی لڑکا کھڑا ہوا اس کے ڈبے کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ جو متواتر پچھلے اسٹیشنوں پر اُسے نظر آ رہا تھا ۔ اب تو عائشہ کو ایک گمنام سا خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا کوئی وجہ تو ہو گی تبھی اس نے یہ درجہ تاک رکھا ہے ۔ پہلے پہل تو وہ اُسے اپنا وہم سمجھی تھی ۔ اور اپنی بے باکی پر اُسے کسی قدر حجاب بھی ہوا تھا ۔ اگر امی نے بھانپ لیا یا اتفاقاً صالحہ باجی ہی نے دیکھ لیا تو کیا کہیں گی ۔ وہ تو ریل کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کی خاطر عین کھڑکی میں جا بیٹھی تھی ۔

پورا کمپارٹمنٹ ریزرو تھا ۔ زیدی صاحب ایک برتھ پر لیٹے ڈان پڑھ رہے تھے ۔ بیگم زیدی ایک ضخیم ناول میں گم تھیں ۔ صالحہ بھی کوئی رسالہ ہی دیکھ رہی تھی ۔ عائشہ کو بیزاری ستانے لگی ! ۔ اس نے جھک کر کافی والے کو آواز دی ۔ اور دُزدیدہ نظروں سے دیکھا کہ وہ لڑکا بک اسٹال سے ہٹ کر بالکل پاس آ کھڑا ہوا تھا ! ۔ اس نے ایک قیمتی گرم لباس پہن رکھا تھا ۔ کلائی پر طلائی چین کی گھڑی بندھی تھی اور گلے میں چمکیلی زنجیر پڑی تھی ۔ اس کے گھورنے کے دیکھنے پر عائشہ کو بڑا غصہ آیا ۔ کافی لئے بغیر اس نے چہرہ پھیر لیا ۔ معلوم نہیں ۔ اتنی چھوٹی عمر میں کیسے یہ لوگ ایسے بدمعاش ہو جاتے ہیں ۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی رہی ۔ صالحہ سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا ۔ وہ تو بے حد

سنجیدہ مزاج فلسفی ٹائپ ہیں۔ ایک گھڑی دے کر وہاں سے ہٹا دیں گی۔ وہ دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔

پھر ریل چل پڑی اور اس نے اطمینان کی طویل سانس لی۔

اوٹی کی سرسبز وادیوں میں دو ڈھائی مہینے گزار کر وہ سب حیدرآباد واپس آ رہے تھے۔ زیدی صاحب کی یونیورسٹی۔ اور ملکہ کا کالج بند تھا۔ کچھ دنوں قبل عائشہ بہت شدید بیمار پڑی تھی۔ اس کی زندگی کے لالے پڑ گئے تھے۔ جب ذرا ٹھیک ہوئی تو ڈاکٹروں نے پہاڑ پر جانے کا مشورہ دیا۔ زیدی صاحب اسے اوٹی لے آئے۔ ان دنوں سب کے سب اس کی بہت خاطریں کرتے تھے۔ اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی۔ اسے خوب تفریحیں کرائی جاتیں۔ دل بہلانے کے سامان ہوتے۔ کبھی وہ سب سربفلک پہاڑوں کے دامن میں پکنک مناتے۔ کبھی سبزہ زاروں میں دن گزارتے اور کبھی گنگناتی جھیلوں کے کنارے فطرت کے اصلی حسن سے لطف اندوز ہوتے۔ آب و ہوا بدلی تو وہ بھی آہستہ آہستہ اچھی ہو گئی۔ اب اس کے رخسار گلاب کی سرخی چرا لائے تھے۔ جسم پھولوں بھری ڈالی کی طرح خوبصورت ہو گیا تھا۔

پھر جب بارش کا موسم شروع ہوا تو واپس ہوئے۔

گاڑی ہواؤں سے باتیں کر رہی تھی۔ جنگل میدان، ندیاں اور پہاڑ سب تیزی سے بھاگے جا رہے تھے۔ پیچھے کہیں دور۔ ایک مسلسل آہنگ تھی ایک مسلسل گونج، اور وہ کھڑکی سے سر ٹیکے سوچ رہی تھی۔ زندگی کا سفر اس چھوٹے بڑے سفر سے کب الگ ہے۔ یہ بے شمار لوگ کہاں سے آئے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں؟ ایک اژدہام ہے نت نئے ہمسفروں کا ایک ہجوم ہے۔ ہر ایک اپنی دھن میں بھاگا جا رہا ہے۔ راستے سے بے خبر۔ منزل سے بیگانہ ۔۔۔ کسی کو ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے کوئی غرض نہیں۔ زندگی کا سفر بھی ریل کا سفر ہے۔ راستے میں لاکھوں نئے نئے

لوگ ملتے ہیں جن سے پل بھر کی شناسائی ہوتی ہے۔ بعض کے چہرے لوحِ دماغ پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتے ہیں۔ مگر جو ایک بار مل کے دوبارہ نہیں ملتے۔ وہ ملتے ہی اس لیے ہیں کہ ایک مرتبہ بچھڑ جائیں۔ اور پھر تنہائی کا احساس روح کو گھیرنے لگتا ہے ایک اضطراب دُھند کی طرح اپنی ذات کے آس پاس چھا جاتا ہے۔ بیزاری اور اکتاہٹ دنیا بھر کی تمام چیزوں سے نفرت ہونے لگتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ آدمی کھال کے باہر نکل جائے۔

اس کی نظروں کے سامنے سے پرچھائیوں کی طرح ہر چیز اڑی چلی جا رہی تھی۔ شور مچاتی وحشت انگیز ہوائیں۔ زرد زرد خوفناک بگولے۔ ترل ترل کرتے جھرنے اور چشمے دف بجاتے ہوئے سیاہ پہاڑ۔ خاموش صحرا۔ سیلابی ندیاں۔ اور نجانے کیا کیا ہے ـــ آسمان بھورے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا! ـــ دور ٹرین کے انجن کو دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی ہولناک عفریت ہے جو دھاڑتا چنگھاڑتا بادلوں کے قعر میں چلا جا رہا ہے۔

موسم خوشگوار تھا۔ برسات کی آمد آمد تھی۔ موسلا دھار بارشوں نے ساری کائنات پر قوس و قزح کے رنگوں کی خوشنما عبا اڑھا دی تھی۔ دن بھر گہرے مٹیالے بادل چھائے رہتے۔ اور رات بھر بارش ہوتی۔ اور صبح کو کوئی حسین اور بے پناہ دلکش منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا!! ـــ

وہ کھڑکی پر سر رکھے دُور افق کو دیکھ رہی تھی۔ ایک سا ل اُفق جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو زمین ہی کا حصہ ہے کہیں نشیب کہیں فراز۔ کہیں خشکی کہیں تری۔ کہیں اس کا جگر چاک ہے۔ اور کہیں وہ اتنی سخت ہے کہ سنگلاخ بن گئی ہے۔ اُفق جوں کا توں ہے۔ اس کے مقدر میں تنہائیوں اور یکسانیت کے سوا کچھ بھی نہیں! ـــ

داغ دل

ٹرین ایک ہلکو را لے کر پھر کسی اسٹیشن پر رک گئی۔

اس نے چونک کر پہلو بدلا۔ اس کی نگاہیں واٹر کولر کے پاس کھڑے اسی لڑکے پر پھر پڑیں۔ جو اپنے ڈبے سے اتر کر اتنی تیزی سے وہاں پہنچا تھا۔ جیسے زمین شق کر کے اُبھر آیا ہو۔ عائشہ کے رگ و پے میں سنسنی تیر گئی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ جیسے ہی اس کی اور لڑکے کی نظریں ملیں۔ ایک ناقابل فہم مسکراہٹ لڑکے کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ کیسی دُکھی مسکراہٹ تھی۔ جس میں حسرت، بے چارگی، تعجب اور تاسف سب کچھ شامل تھا!۔

اگر اس کے درجے میں کوئی اور ہوتا تو وہ سمجھ لیتی کہ اس کی قابل اعتراض نگاہوں کا مرکز کوئی اور ہے۔ مگر اب۔ یہ چوتھی پانچویں مرتبہ وہ اس حرکت کو اتفاق سمجھنے پر آمادہ نہیں تھی۔

صالحہ نے اوپر سے ٹفن باکس اتارا۔ اور باسکٹ سے پلیٹیں نکال کر درمیانی سیٹ پر سجانے لگی۔ اس کے چہرے پر طمانیت اور لاپرواہی تھی۔ عائشہ ہلکی سی سانس لے کر باپ کے پہلو میں آبیٹھی۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ مڑ کر دیکھ لے۔ لڑکا کھڑا ہے کہ چلا گیا۔ لیکن وہ مڑنے کی بھی ہمت نہ کر سکی۔ گاڑی پھر چل پڑی۔ بیگم زیدی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا بات ہے۔ کیا سوچ رہی ہو؟"

"جی؟ ....." وہ چونک پڑی "کچھ بھی تو نہیں امی" اور گھبرا کر رکابی پر جھک گئی۔

"کلیجہ دھکڑ پکڑ کر رہا ہوگا امی۔ اب پھر وہی لیل و نہار ہوں گے وہی کالج کی بھاگ دوڑ ہوگی۔ اور یہ ہمیشہ کی بدشوق ہے" صالحہ نے کہا۔

وہ چپ چاپ کھاتی رہی۔

صالحہ اُسے چھیڑنے کو بولی۔ "امی میں تو سمجھتی ہوں کہ اس نے بیماری کا بھی بہانہ ہی بنایا تھا۔ ہمیشہ بابا جان سے الجھتی رہتی تھی کشمیر نینی تال اور رنجانے کہاں کہاں چلنے کے لئے۔ دال نہیں گلتی تھی۔ نئی ترکیب لڑائی کہ بیمار بن گئی اور اس طرح اُوٹی تک اچھل پڑی ــــ!"

وہ ـــ وہ بیہوشی وہ ہذیان ـــ!" عائشہ تڑپ کر بولی۔ اس نے بابا جان کو مسکراتے دیکھ لیا تھا!۔

وہ سب فریب نظر تھا ہمارا ــ" صالحہ نے شرارت سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کو بیں نے دھوکا دیا ہوگا شاید!ـ" وہ بُراسا منہ بناکر بولی۔

"ارے۔ انھیں چکرا دینا کیا مشکل ہے۔ بوائلر پر رکھ کر تھرمامیٹر دکھا دو تو وہ بے چارے یہی سمجھیں گے کہ چار سو بیس ڈگری تک بخار ہو آیا ہے۔" صالحہ نے کہا۔ بس دوڑا دیا پہاڑ تک!ـ"

بابا جان!ـ" عائشہ نے احتجاج کیا۔

اُف فوہ ـ" وہ بولے: "بیماری بڑی سخت تھی۔ بہر حال خدا نے رحم کیا۔

دُور پار دشمن" بیگم زیدی نے کہا: "پرانی باتیں نہ کرو۔ یاد کرنے سے کلیجہ کانپتا ہے۔"

"اچھی طرح گھوم پھر چکے۔ میرا دل بھی چاہتا تھا کہ ایک چکر پُرفضا مقام کا لگا دوں" زیدی صاحب نے کہا۔ اور کھانا ختم کرکے صالحہ سے بولے: "بیٹی چائے بناؤ ـــ"

اُس نے سب برتن وغیرہ سمیٹ کر رکھ دئے اور اسٹوو پر چائے کا برتن رکھ دیا زیدی صاحب نے سگار سلگا لیا۔ بیگم نے اپنا ننھا سا سفری پاندان کھول کر سامنے رکھ لیا۔ عائشہ باہر نظریں دوڑا رہی تھی۔ گاڑی کسی پل کو عبور کر رہی تھی۔ حدِ نظر تک گدلا گدلا پانی لہریں لے رہا تھا۔ اور بہت دور آسمان پانی سے اپنا چہرہ دھو

رہا تھا! — اور پھر اُفق پر ایک دُھندلی سی شبیہہ ابھری۔ اس کے خدوخال نمایاں ہوئے۔ عائشہ کی پلکیں جھپک گئیں۔ اب وہ جانا پہچانا چہرہ اس کے برابر دوڑ رہا تھا! — معصوم مغموم اور مضطرب آنکھوں والا چہرہ —!

صالحہ نے ایک پیالی اُسے بھی تھما دی — اور خود اس کے پاس آ بیٹھی۔

پھر گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی۔ اور عائشہ کے سامنے پھر وہی لڑکا کھڑا تھا! انسانوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی اس کی نظریں تیر کی طرح اسی کھڑکی کی طرف لگی تھیں! جہاں دونوں بیٹھی تھیں۔ اب کی عائشہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"باجی۔ اس آدمی کو دیکھ رہی ہیں آپ؟" اس نے چپکے سے اشارہ کر کے بتایا: "پتھر کی بنچ کا سہارا لئے —!"

"آدمی؟" صالحہ نے فوراً ہی اُسے دیکھ لیا: "ارے۔ وہ آدمی ہے؟ مشکل سے پندرہ سولہ سال کا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ کیا خاص بات ہے اس میں؟"

"کئی اسٹیشنوں سے میں دیکھ رہی ہوں۔ وہ ہماری ہی طرف گھورتا نظر آرہا ہے۔ آخر کیا بات ہے؟ —"

"تمہیں کیا فکر ہے عائشی۔ دیکھ رہا ہے تو دیکھنے دو —"

"اچھی بات ہے۔" عائشہ نے کہا اور ایک طویل سانس لے کر اس طرف کی کھڑکی بند کر دی — !"سفر بھی تو ختم ہے! —"

صالحہ نے کچھ سوچ کر پھر اُسے دیکھا۔ عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ مگر جسامت میں وہ بڑا اچھا تھا۔ سفید اور گلابی رنگت۔ گھنی گھنی پلکوں سے بے حد حسین اور گہری آنکھیں دلکش دہانہ۔ گہرے کالے بال۔ جو اس کی شہابی پیشانی پر بکھرے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ سرمئی پتلون اور سفید بے داغ قمیص میں اس کی شخصیت نکھر آئی تھی! —

کسی متمول اور معزز گھرانے کا فرد لگتا ہے!" صالحہ بولی: "شاید اپنے خاندان
کا اکلوتا ہی ہو تبھی غلط راہوں پر نکل گیا۔ صاحبزادے بے تحاشہ انگریزی فلمیں دیکھتے
ہوں گے۔ ساری ساری رات جاسوسی ناول پڑھتے ہوں گے۔ ابھی سے فضول باتوں
کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ سچ تو ہے۔ توبہ۔ مجھے بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا
ہے۔ ایک مرتبہ بھی پلکیں نہیں جھپکائیں۔"

"جی ہاں۔ وہ تو مسکرائے بھی تھے!" عائشہ نے اطلاع دی۔

"ہٹاؤ بھی ـــ" صالحہ نے کہا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ کر کھڑکیاں پھر اوپر
چڑھا دیں۔ گاڑی نے رفتار پکڑی اور عائشہ پھر اپنی سوچوں میں گم ہو گئی۔ صالحہ گرم
شال اوڑھ کر لیٹ گئی اور اپنا ناول کھول لیا۔

معلوم نہیں کون ہے؟ عائشہ نے سوچا۔ بے چارہ۔ کسی افتاد کا شکار تو
ہے۔ ابھی تو اس کی عمر بھی اتنی معلوم نہیں ہوتی۔ شاید مجھ سے بھی دو تین سال چھوٹا ہو۔
اگر کسی اور کے ساتھ یہی حرکت کرتا تو پٹ جاتا۔ بابا جان ہی کو معلوم ہوتا تو وہ اتر
کر ڈانٹ دیتے۔ عمر یہ اور بچپن ایسے۔ اکلوتی اولاد سے غیر معمولی محبت اور بے پایاں
پیار انھیں ہمیشہ غلط راہوں پر لے جاتا ہے۔ معقول تربیت، اور سخت نگہداشت ان
کے لئے بہت ضروری ہے۔ بے جا محبت اور ہر فرمائش کی پذیرائی ان کے لئے سم قاتل
ہے۔ یہ بے چارہ آگے چل کر بدمعاش بن جائے گا۔ لڑکیوں کے پیچھے دوڑے گا۔
بدنام ہوگا۔ گالیاں کھائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تعلیم کے نام پر صفر ہی ہو۔ اگر کچھ
کچھ پڑھ لکھ بھی گیا تو کس کام کا۔ کالج کا غنڈہ بنے گا لفنگوں کا سربراہ۔ استادوں
کی پگڑیاں اچھالے گا۔ ہر فساد اور ہنگامے میں سب سے آگے رہے گا۔ جیل جائے گا۔
کیریئر برباد کرے گا۔ غرضیکہ کوئی برا کام اس کے ہاتھوں سے ہونے سے رہ نہ
جائے گا۔ خدا تو رحم کرے۔ ان لڑکوں پر رحم کرے جو ادا! ان کی نظروں میں شاہین بیکے

ہیں! اب کیا یہی ہے قوم جو آگے چل کر عنانِ حکومت سنبھالے گی۔ افسوس افسوس۔
بڑے غمگین خیالات اُسے ستاتے رہے۔ معلوم نہیں اس خوبصورت لڑکے کو ایک بدمعاش لڑکا سمجھنے کا جی کیوں نہیں چاہتا تھا۔ وہ حرکتیں تو سب لوفروں کی سی کر رہا تھا۔

زیدی صاحب کچھ دیر سگار پیتے رہے۔ پھر ہلکی سی آواز میں بیوی سے بولے۔
"تمھارا سلوک شفقت سے قدرے ناروا ہے۔ شمسہ!" انھوں نے رک کر بجھا ہوا سگار سلگایا۔ اور ایک گہرا کش لے کر کہا: "اب اُن کی عمر ایسی نہیں کہ وہ ہماری باتیں ایک کان سنیں دوسرے کان اڑادیں۔ اُن کے خیالات ہماری طرف سے خراب ہو جائیں گے!"
شمسہ بیگم کا چہرہ لالہ فام ہونے لگا: "خراب کرلیں۔ وہ میرے یا آپ کے کون عزیز ہوتے ہیں۔ آپ کو صرف یہی خیال آرہا ہے کہ میں انھیں اپنے ساتھ اُونٹی ہیں لائی۔ واپسی پر رقم دے دوں گی۔ بس یا اور کچھ؟"
"خیر اب تو کہیں کا موسم نہیں ہے۔" زیدی صاحب نے جواب دیا۔ "مگر میں یہ کہتا ہوں کہ میری عمر اب بڑھاپے کی ہے۔ جو کچھ میں نے ان کے ساتھ کیا ہے۔ اس کا اجر تو خیر خدا دے گا۔ مگر انھیں بھی اس کا احساس تو ہوگا۔ اُن سے میری توقعات بھی وابستہ ہیں۔ وہ ہمارے کوئی نہیں۔ مگر اچھا سلوک غیروں کو بھی اپنا کر دیتا ہے۔"
"آخر میں نے کیا کیا ہے جو آپ کو ناگوار گزرا ہے۔" بیگم زیدی چیں بجبیں ہو کر بولیں: "اگر آپ ہمیشہ سے ان کے باپ بنے رہے تو میں نے بھی ماں بن کر دکھایا۔ کبھی انھیں شکایت کا موقع نہیں دیا۔"
زیدی صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ سگار کھڑکی کے باہر پھینک کر آنکھیں بند کرلیں۔ بیگم نے کہا: "خیر اب میں کسی اچھی لڑکی کو دیکھ کر اُن کی شادی کر دوں گی۔ وہ

ہمارے گھر سے جائیں۔ میں جانتی تھی کہ یہ جھگڑے ایک نہ ایک دن اٹھیں گے ضرور...!

صالحہ نے کتاب اُلٹ کر سینے پر رکھ لی۔

شفقت؟ — اس کے ذہن میں شیشے کی کرچیں چبھنے لگیں۔ خیالات کے اسکرین پر ایک لمبا چوڑا مردانہ پیکر اُبھرا۔

پہلے پہل جب اس نے ہوش سنبھالا ہے تب انھیں اپنا حقیقی بڑا بھائی ہی سمجھا تھا۔ وہ تھے بھی ایسے ہی۔ بڑے پُر محبت۔ بے حد مخلص۔ انھوں نے بھی صالحہ کو ہمیشہ ہی اپنی عزیز سمجھا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتے۔ ساتھ ساتھ پڑھتے لکھتے۔ اسے سیر کرانے لے جاتے۔ اپنے حصے کی تمام چیزیں اسے دے دیتے۔ بابا [illegible] خرچ کی رقم اکٹھا کر کے اس کے لیے کوئی خوبصورت تحفہ لاتے...!

وہ دس بارہ برس کے ہو گئے۔ صالحہ ننھی منی پانچ سال کی تھی۔ جب وہ مدرسہ جانے لگی تب اسے انگلی پکڑ کر مدرسہ لے جاتے۔ اس کے لئے پنسل رنگ برنگے قلم اور کاغذ لاتے۔ کاپیوں پر ورق چڑھاتے اور نہایت دلکش انداز میں اس کا نام لکھتے۔ کبھی پھولوں کے اندر کبھی چاند ستاروں میں —!

ان کی محبت پر کوئی کڑی پابندی عائد نہیں تھی۔ ابھی بچے ہی سمجھے جاتے تھے۔ ان کی مسلسل محبتوں نے صالحہ کے ننھے سے دماغ پر ایک لافانی اور انمٹ نقش قائم کر دیا جو ہمیشہ پختہ ہوتا رہا۔ وہ ان کی محبتوں کا جواب دینے لگی۔ اپنے حصے کے چاول چپکے سے انھیں کھلا دیتی۔ چاکلیٹ ٹافی اور کھلونے۔ جو بھی ہاتھ لگتا۔ شفقت کو دے دیتی۔ اس نے کبھی خود کو شفقت سے اور شفقت کے وجود کو اپنے سے الگ نہیں خیال کیا تھا!

اور جب عائشہ گھٹنیوں چلنے لگی۔ تو وہ ان دونوں کا کھلونا بن گئی۔ وہ [illegible] کے پاس رہتی۔ عائشہ نے بھی ہوش سنبھال کر شفقت کو دیکھا اور اپنا بڑا بھائی...

کے بغیر وہ نامکمل تھی! ۔

بہت عرصہ تک دونوں بہنوں کو علم نہ ہو سکا کہ وہ ان کے حقیقی بھائی نہیں تھے وہ اُن کے کوئی بھی نہ تھے! ۔

اُس تلخ اور ناگوار واقعہ کی یاد ابھی تک عالیہ کے ذہن میں تازہ اور زندہ تھی۔ شاید بابا جان کی برسی ہوئی تھی۔ گھر میں بہت سے مہمان بھرے ہوئے تھے۔ دونوں بہنیں زرق برق لباس میں لپٹی تتلیوں کی طرح اڑی اڑی پھر رہی تھیں۔ اپنی معصوم خوشیوں کے ہجوم میں انہیں شفو بھیا کا خیال نہیں آیا۔ وہ سمجھتیں تھیں کہ جیسے پرویز، خالد اور سجاد اپنے دوستوں میں بیٹھے گپ شپ کر رہے اور ہنس رہے ہیں، اسی طرح شفو بھیا بھی اپنے دوستوں میں ہوں گے ۔۔۔!

امی کی ایک معزز سہیلی آئی ہوئی تھیں معلوم نہیں وہ کسی گورنر یا وزیر کی بیوی تھیں یا خود کہیں کی بادشاہ سلامت تھیں کہ غرور اور جلال اُن کے تیوروں سے برس رہا تھا! ۔ نہایت ہی قیمتی کپڑوں میں لپٹی سونے چاندی اور ہیرے موتی میں غرق وہ بڑی آن بان سے صوفہ پر متمکن تھیں۔

امی نے عالیہ اور عائشہ کو اُن سے ملانے بلا بھیجا۔ جب وہ دونوں پاس آئیں تو اُن بیگم صاحبہ نے بڑی گہری اور تیز نگاہ دونوں پر ڈالی۔

"عالیہ اور عائشہ۔ کانونٹ میں پڑھ رہی ہیں! ۔" امی نے کہا تھا۔

"صاحبزادے شاید باہر ہوں گے! ۔" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

امی کے چہرے پر غم کے سائے پھیلتے نظر آئے "خدا نے صرف بچیاں دی ہیں ویسے چاند سا بھی ایک لڑکا تھا۔ مگر وہ ڈھائی سال کا ہو کر گزر گیا۔"

"مگر امی شفقت بھیا ۔۔؟؟ ۔" بے ساختہ عالیہ بول اٹھی۔

"چپ رہو ۔۔!" امی نے جھڑک دیا۔

کون شفقت؟ —" خاتون نے بڑے اہتمام سے خاصدان کھولا چاندی میں لپٹی ایک گلوری لبوں میں دبالی اور بے نیازی سے پوچھا۔

کوئی نہیں۔ ایک لاوارث لڑکا ہے۔ زیدی صاحب کا پروردہ۔" امی نے کہا۔ پھر وہ تو اُن خاتون سے باتیں کرنے لگیں اور صالحہ اٹھ کر چلی آئی۔

لاوارث لڑکا۔ پروردہ — بابا جان کا — کیا وہ ہمارا کوئی نہیں۔ اس کے چھوٹے سے دماغ میں ہتھوڑے سے گونج رہے تھے!—

لاوارث — لاوارث اور وہ جلدی سے شفقت کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کا خیال غلط نکلا وہ دوستوں میں بیٹھے گپ شپ نہیں کر رہے تھے۔ وہ ہلکے اندھیرے میں لیٹے بستر پر اوندھے منہ لیٹے سسکیاں بھر بھر کر رو رہے تھے۔

شفو بھیا —" وہ اُن کے کندھے سے چمٹ گئی "کیا ہوا؟ — امی نے کچھ کہا بابا جان نے مارا — آپ کو؟ —"

شفقت نے آستین سے آنسو پونچھے۔ ایک بار سر اٹھا کر صالحہ کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ اتنے میں عائشہ بھی پہنچ گئی "امی نے کچھ کہا ہوگا۔ اچھا میں بابا جان سے جا کر کہتی ہوں"

سنو۔ عاشی۔ امی سے بابا سے کچھ مت کہنا —" وہ جلدی سے بولے "میں کپڑے بدل کر ابھی آتا ہوں —"

مگر آپ رو کیوں رہے تھے؟ —" صالحہ نے پوچھا۔

شفقت اپنی عمر کی اس منزل میں تھے جہاں پُرسشِ احوال زبان سے نہیں بلکہ آنکھوں سے جواب دیا جاتا ہے۔ مگر نہ تو اُن کے لب ہلے نہ پلکیں اٹھیں۔ وہ خاموش بیٹھے رہے سوچتے رہے کہ ابھی ابھی امی نے پھٹکار کر کہا تھا کہ اتنے مہمانوں کے سامنے جوتیاں چٹخاتے ہوئے مت چلے آنا۔ ورنہ بری طرح خبر لوں گی!— وہ

اب کیسے اُن کے سامنے جاؤں۔

"چلئے نا باہر۔" وہ مُصر تھیں۔

"صالحہ، سنو تو۔۔۔؟"

"نہیں میں کچھ نہیں سنتی۔۔۔!" وہ اڑ گئی۔

"صالحہ۔ میں باہر جاؤں گا تو سب لوگ مجھے دیکھ کر ہنسیں گے۔" وہ بولے۔ "تم البتہ باہر جاؤ۔" عنبر بولا۔ "میرے سر میں درد بھی ہے۔ میں اب سو جاؤں گا۔"

"شفو بھیا؟۔۔۔" یکایک عائشہ بولی: "لاوارث لڑکا کون ہوتا ہے۔ امّی ابھی آپ کو کہہ رہی تھیں کہ آپ لاوارث لڑکے ہیں۔ باباجان کے پروردہ۔۔۔!"

"عائشہ؟۔۔۔" صالحہ نے سہم کر کہا۔

شفقت کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ انھوں نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا کچھ بول نہ سکے۔

اتنے میں باہر سے امّی کی آواز آئی۔ شفقت گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ لڑکیاں الگ سمٹ گئیں۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" دوسرے لمحے وہ پردہ ہٹا کر اندر آئیں۔ اور بجلی جیسی یکبارگی چار خوفزدہ نظریں اُن کی طرف اُٹھ گئیں۔

"کیا کر رہی تھیں یہاں؟۔۔۔" انھوں نے اس طرح پوچھا کہ صالحہ ڈر گئی۔

"امّی، شفو بھیا اندھیرے کمرے میں پڑے رو رہے تھے۔ ہم ان سے کہہ رہے تھے کہ کپڑے بدل کر باہر آئیں۔۔۔ امی۔۔۔ وہ۔۔۔!"

"نوکری بن۔۔۔ وہاں سب لوگ تم دونوں کو پوچھ رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہاں کیا جی لگتا ہے۔ شفقت! تمہاری یہ عمر ایسی نہیں کہ تم لڑکیوں کی طرح اوندھے منہ لیٹ کر ٹسوے بہاؤ۔ تم بھی باہر نکلو۔ ملازم کھانا لے جا رہے ہیں۔ ان کی

نگرانی کرد ہے۔

پھر سب کمرے سے چلے گئے۔

صالحہ نے بہت کوشش کی کہ امی کی باتوں کا اثر شفقت کے ذہن سے کم ہو جائے مگر وہ روز بروز خاموش اور گم صم رہنے لگے۔ وہ جانگداز و جانگسل حادثہ اگر صالحہ کو جیا کا تیسا یاد تھا تو اس کے نقش شفقت کے ذہن پر بھی پتھر کی لکیر کی طرح ثبت و جامد موجود تھے جنھیں ماہ و سال کی سخت گردشیں بھی مٹانے میں ناکام رہی تھیں۔

معصوم بچپن ایک ریشمی ڈوری تھا۔ جس میں سب ساتھی بندھے ہوئے تھے پھر آہستہ آہستہ شباب آیا۔ جوانی کا احساس ہوا۔ اور اس احساس نے تکلف غیریت اور حجاب کی ایک اونچی دیوار درمیان میں کھڑی کر دی۔

اگر شفقت کو یہ خیال تھا کہ اب اُن کا ملنا صالحہ سے ناممکن تھا تو صالحہ بھی سمجھتی تھی کہ شفقت اُس سے بڑی دور ہو گئے ہیں۔ کسی نے ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں کہا یہ تک نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے لئے کیا سوچتے تھے۔ صالحہ کے دل میں ان کے لئے بے پایاں ہمدردی موجود تھی۔ وہ انھیں قابل رحم سمجھتی تھی۔

اُن کا کمرہ باہر برآمدوں کی طرف تھا۔ صرف طعام خانے ہی میں اُن کا ساتھ ہوتا۔ بی۔ ایس۔ سی کر رہے تھے۔ اُن کی کفالت کا مکمل بار زیدی صاحب پر ہی تھا۔ وہ انھیں بہت چاہتے تھے۔ لیکن بیگم زیدی نے اپنی اُنسیت کا کبھی کوئی اظہار نہیں کیا۔ اتنی ہی رعایت کیا کم تھی کہ وہ سب کی طرح انھیں امی اور زیدی صاحب کو باباجان کہہ کر مخاطب کرتے تھے!۔

بیگم زیدی کو تو اتنا ہی معلوم تھا کہ ایک سرد اور ٹھٹھرتی ہوئی شام کو یونیورسٹی سے واپسی پر زیدی صاحب چار سال کے ایک لڑکے کو اپنے ساتھ لے آئے تھے اور کہا تھا کہ وہ بچہ اُن کے دروازے پر کھڑا رو رہا تھا! سردی کی شدت سے بچے کا

چہرہ نیلا ہو رہا تھا۔ اس کے بدن پر گرم اور قیمتی لباس تھا لیکن جو بری طرح کانپ
رہا تھا۔ بیگم نے اسے کھانا کھلایا۔ کافی بلا زحمتی۔ انھوں نے اس سے نام پتہ
پوچھا۔ مگر وہ نہ بتا سکا۔ بیگم زیدی کا خیال تھا کہ بچہ ان کے یہاں تھوڑی ہی دیر رہے
گا۔ لیکن جب دو دن گزر گئے اور کوئی اس لاوارث بچے کو پوچھنے نہیں آیا تب
تو وہ بڑی متفکر ہوئیں۔ انھوں نے خود سارے محلے میں دریافت کیا لیکن کوئی
گم شدہ بچے کا دعویدار نہ نکلا۔

بیگم زیدی کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ بچے کو رکھ کر کہاں پالتیں۔ اپنی
پرانی خادمہ کے حوالے کر دیا۔ وہ تین برس تک وہ اسی کے پاس رہا۔ جب وہ
آیا مر گئی تب مجبوراً بیگم زیدی کو اس کی دیکھ بھال کرنی پڑی۔ وہ بہت پیارا ذہین
اور بھولا بھالا بچہ تھا کبھی کسی بات پر ضد نہ کرتا۔ رونا دھونا تو جانتا ہی نہ تھا
جیسے ماں باپ ہو۔ زیدی صاحب اس سے بہت محبت کرنے لگے تھے۔ بیگم زیدی
کو بھی شروع میں تھوڑی سی محبت اس سے ضرور تھی مگر ان کے یہاں کی اولاد ہوئی
وہ شفقت دور کرنا پڑ گیا۔ پھر صالحہ اور عائشہ پیدا ہوئیں۔ اور بیگم زیدی کے
دل سے شفقت کا خیال بالکل جاتا رہا۔

اب وہ چوبیس پچیس سال کے ایک گبرو بڑے جاذب نظر بے حد خوش رو
خوش پوش نوجوان تھے۔ گندمی شفاف رنگ۔ تیکھے نقش و نگار۔ مضبوط و بلند
قد و قامت۔ غیر معمولی سنجیدگی اور خاموشی نے ان کی شخصیت کو پرکشش بنا دیا تھا۔
عائشہ سے انھیں چھوٹی بہن کی سی محبت تھی۔ مگر صالحہ اُن کی بچپن سے ہمدرد
دوست تھی۔ اب وہ خود بھی ان کے سامنے جاتے ہوئے گھبراتی۔ اُن آنکھوں سے اُمڈتا
ہوا ایک طلسم زدہ جذبہ بے حد گہری اور بے انتہا سنجیدہ تحریر۔
جب شفقت نے صالحہ سے ملنے یا باتیں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ خود ان

احساس پختہ ہوتا گیا وہ سب سے دور دور رہنے لگے۔ سارے گھر کی ذمہ داریاں انھیں پر تھیں۔ زبیدی صاحب کے کام، بیگم زبیدی کی ضرورتیں ان سے وابستہ تھیں۔ عائشہ کا ہوم ورک تک وہی کرتے تھے۔ اس سے انھیں غایت درجہ محبت تھی اگر انھیں کبھی بھولی بھٹکی ہنسی آتی تو صرف عائشہ کی باتوں پر۔

وہ اپنے دل میں آپ جھانکتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ جو الاؤ بھڑک رہا تھا کہیں اس کی پرچھائیاں چہرے پر نہ پڑ جائیں۔ چہرہ۔ جو دل کا آئینہ ہے!!

پھر زندگی اپنے پرانے محور پر لوٹ گئی تو بہت مصروف ہوگئی۔ زیدی صاحب یونیورسٹی میں انگریزی شعبہ کے صدر تھے۔ ساری زندگی تو اُن کی درس و تدریس میں گزر گئی تھی وہ اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ صالحہ اُن کا مطمعِ نظر جانتی تھی اور اُن کی مرضی کے مطابق ہی کر رہی تھی۔

ادبی دلچسپیوں نے اُسے ایک اچھی فنکار بنا دیا تھا۔ اس کی تحریریں معیاری رسائل میں چھپتیں اور اچھے لکھنے والے اُسے خراجِ تحسین ادا کرتے تھے۔ ادب سے اسکی غائت درجہ دلچسپی کا راز ایک بلند پایہ و اعلیٰ فنکار انیس گمنام کی تحریروں سے وابستہ تھا۔ گمنام کے افسانوں کا اس نے ایک پورا فائل بنا رکھا تھا۔ وہ ایک بلند مرتبہ قلمکار تھا کہ انسانی زندگی کے تمام احساسات پر اس کی مضبوط گرفت تھی۔ اس کی تحریر میں خورشید بکھرے تبسم کی چاندنی بھی ہوتی تھی۔ غموں سے لبریز آہوں کا دھواں بھی۔ زندگی کبھی اس کے لئے منور و تاباں حسین کہکشاں ہوتی اور کبھی غبارِ راہ میں پسپتی پگڈنڈی۔

گمنام کے شاہکار پڑھ پڑھ کر صالحہ نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا! زیدی صاحب اس کے اس ذوق کو بہت سراہتے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔

لیکن عائشہ سترہ اٹھارہ سال کی سیماب آسا فطرت کی مالک تھی۔ اُسے تعلیم سے بھی بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ صرف اس لئے پڑھتی تھی کہ لوگ کہیں اُسے فارغ التحصیل ہی نہ سمجھ لیں۔ بڑی مشکلوں سے پاس ہوئی۔ اور اب اتنے دنوں باہر گزار آئی تھی۔ اس کا دماغ ہی ماؤف ہو گیا تھا۔ گھر میں دل نہ لگتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے بال و پر چھین کر پنجرے میں بند کر دیا ہو۔ راتیں تو کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتیں۔ مگر دن

پہاڑ لگتے۔ بادلوں کی دبیز گلیم اوڑھے ہوئے دن۔ سورج کا چہرہ کئی کئی دن ابر کے نقاب سے باہر نہ آتا۔ تیز ہوائیں سفیدے شفتالو اور یوکلپٹس کے اونچے درختوں میں بھیانک سیٹیاں بجایا کرتیں۔ نت نئے پرندے جانے کہاں کہاں سے آ گئے تھے جن کے ننھے گیتوں میں گونجا کرتے۔ ایک اجنبی خوشبو ماحول میں رچی بسی رہتی۔ جیسے محسوس کر کے کبھی دل ڈوبنے لگتا اور کبھی سرشاری سی چھا جاتی۔ دونوں احساسات کا تجزیہ اس کے لئے مشکل ہوتا! ـــ اور نتیجے میں وہی بیزاری اور اضطراب۔
کبھی کبھار اسے اس خوبصورت لڑکے کا خیال آتا جو اس کا انجانا ہم سفر تھا۔ پتہ نہیں۔ کدھر سے آیا تھا کہاں گیا؟ صورت شکل سے وہ بدمعاش نہیں لگتا تھا۔ کسی معزز خاندان کا فرد معلوم ہوتا تھا۔

جب بھی وہ پڑھنے بیٹھتی۔ کھلے صفحے پر وہی چہرہ مرتسم ہو جاتا متبسم و مغموم چہرہ عشق و محبت کی بکواس سے وہ قطعی ناآشنا تھی۔ بلکہ وہ تو ایسی چیزیں ہی نہ پڑھتی۔ جن میں محبت کی ناقص کہانیاں لکھی ہوتیں۔ پھر یہ کون سا احساس تھا۔ جو دل کی گہرائیاں کریدر رہا تھا!

سہ پہر دلکش تھی۔ نکھری نکھری دھوپ بام و در پر چمک رہی تھی۔ برآمدے کے نیچے موگرے مہک رہے تھے۔ اور گل چاندنی کے سفید سفید کٹورے کھلنے لگے تھے وہ شہ نشین کی جالی سے ٹیک لگائے سامنے والی نیلی کوٹھی کو دیکھ رہی تھی جس کا مدتوں سے بند پڑا ہوا قفل اب کھلا ہوا تھا۔ اور ٹین کے شیڈ کے نیچے ایک لمبی سی بادامی رنگ کی گاڑی کھڑی تھی۔

اُسے یہ نیلی کوٹھی ہمیشہ سے پسند تھی۔ جالی دار دروازے۔ چکردار زینے۔ صاف شفاف برآمدے۔ اور سرسبز لان۔ مدتوں سے کوٹھی بند پڑی تھی۔ لیکن اب اس پر نیا روغن بھی تھا۔ اور آب و تاب بھی نئی تھی۔ کھڑکیوں پر قیمتی پردے لہرا رہے تھے۔

چکردار زینوں پر سرخ و سیاہ دھاری دار بانات بچھا ہوا تھا۔ برآمدے میں جا بجا قمقمے لٹک گئے سجے ہوئے تھے۔ ایک باوردی ملازم کھڑکیوں کے شیشے صاف کر رہا تھا۔

پھر اس کی نظریں ایک خاتون پر پڑیں۔ سیاہ بلاؤز اور زرد ساڑی میں وہ بہت پروقار اور جاذب نظر تھیں۔ اس نے سوچا کہ اگر انھوں نے اس کی طرف دیکھا تو پھر وہ سلام ضرور کرے گی۔ مگر انھوں نے کسی ملازم کو پکارا اور دوسرے ہی لمحے پردہ ہٹا کر اندر چلی گئیں۔ پھر کسی نے برآمدے میں روشنی کی اور شمسہ کو ایک مرد کی پشت دکھائی دی۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس۔ وہ گھبرا کر اندر بھاگ آئی۔

دالان میں زیدی صاحب اور بیگم زیدی بیٹھے کسی اہم موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ شمسہ ان کے پاس جا بیٹھی۔

"تم اپنے بھائی صاحب کو سمجھا دو۔ ہماری لڑکی وہ روایتی بیر نہیں ہے جس پر چاروں طرف سے ڈھیلے پھینکے جاتے ہیں۔" زیدی صاحب کہہ رہے تھے۔ "اسی میں بہتر تھا کہ دوسروں کی لڑکی کیسے اور کیوں کر اور دلوں پر بوجھ بن جاتی ہے کیونکہ ان کے زندہ جنازے کے اٹھنے کی فکر میں ان کا خواب و خور حرام ہو جاتا ہے۔"

"میں کیوں ایسا بدترین جواب دوں" شمسہ بیگم نے ناگوار لہجے میں کہا۔ "وہ آپ ہی سمجھ جائیں گے کہ ہماری لڑکی ابھی کسی لڑکے سے بھی بیاہی نہیں ہے۔"

"نہیں، ابھی تو لڑکی کو تعلیم میں رکھنا نہیں ہے۔" زیدی صاحب بولے۔ "جب بھی موقع آئے گا اس کی شادی ہو جائے گی لیکن میں اتنی چھوٹی عمر میں اسے گھربار کی زنجیریں پہنا دینا گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ ابھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گی۔"

"آپ میری بات نہیں سمجھے۔" بیگم زیدی نے کہا۔ "میں کب کہتی ہوں کہ وہ تعلیم نہ حاصل کرے۔ لیکن اچھے لڑکے ہر وقت انتظار میں نہیں بیٹھے رہتے۔ وہ تو خراب لڑکیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ میں شمسی کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ خود کو

ہیں اُن کی بہن گریجویٹ ہیں۔ کبھی وہ صالحہ کی تعلیم میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ وہ شادی کے بعد پڑھتی رہے گی!۔"

"بیگم۔ شادی نام ایک امتحان کا ہے۔ اور شادی کے بعد نئے نئے امتحان عورت کی زندگی میں آنے لگتے ہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ کیا کوئی لڑکی شادی کے بعد بھی پڑھ سکتی ہے بیگم"

"آپ پچھتایئے گا۔" وہ شدید غصّے کے مارے اتنا ہی بول سکیں۔

"آج تک تو میں اپنے فیصلے پر نہیں پچھتایا ہے۔"

بیگم زیدی نے اپنے سامنے رکھا ہوا خط اٹھایا اور آہستہ آہستہ چاک کر کے پھینک دیا۔ پھر کمرے سے نکل گئیں۔ زیدی صاحب بیٹھے چند منٹ سگار پیتے رہے۔ پھر وہ بھی اٹھ کر چلے گئے۔ عائشہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر شفقت کے کمرے میں آئی۔

اپنے کمرے میں دریچے کے سامنے نیم دراز شفقت سگریٹ کے کش لے رہے تھے عائشہ کو دیکھ کر سگریٹ باغ میں پھینک دیا اور پاؤں سمیٹ لیے۔ وہ اُن کی کرسی کے ہینڈل پر ٹک گئی!۔

"آج پھر امی اور بابا جان میں جھگڑا ہو گیا شفو بھیا؟ —" اُس نے پیار سے ان کے بالوں میں اپنی انگلیاں اُلجھا لیں "باجی۔ اپنے دل میں کیا سوچتی ہیں؟۔ آپ نے کبھی حشمی بھائی کو دیکھا ہے۔ کیسے اچھے ہیں۔ معلوم نہیں بابا جان کو کیا دشمنی ہے؟"

شفقت نے ہلکی سی آہ بھر کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ہاں بے بی۔ وہ بہت اچھے ہیں"

"ماموں جان نے حشمی بھائی کے لئے لکھا ہے۔ مگر بابا جان کو غصّہ آ گیا —"

"تم چاہتی ہو۔ تمھاری باجی کی شادی ہو جائے!۔"

"آپ نہیں چاہتے؟ —" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

شفقت خاموش رہے۔ عائشہ نے کچھ کہا ۔۔ "میں تو اس دن کے انتظار میں ہوں۔"

میری باجی دُلہن بنیں گی۔ اُن کے ہاتھوں میں مہندی رچے گی۔ مانگ میں افشاں چمکے گی۔ ایک بڑا خوبصورت شاندار دولہا آئے گا۔ اور پھر ــــ!"

"یہ تو سب کچھ تمھارے ساتھ بھی ہوگا!" شفقت نے مسکرا کر کہا۔

وہ ہولے سے شرمائی "اونہہ۔ میرے ساتھ کیوں۔ آپ کے ساتھ کیوں نہیں!"

"تم چاہو گی تو وہ بھی ہو جائے گا بے بی۔ مگر ابھی یہ خواب ادھورا ہے۔"

"ارے اللہ شادیوں کو چولہے میں ڈالیے۔" عائشہ یکبارگی اٹھ کھڑی ہوئی: "چلیے کہیں گھومنے چلیں ــ!"

"اتنا بہت سا گھوم پھر آئیں۔ ابھی اور جی چاہتا ہے!"

"شنو بھیا۔ میں بڑی خراب ہوں۔ میرا پڑھنے لکھنے میں جی نہیں لگتا۔" عائشہ نے اداس ہو کر کہا "آپ پر اور باجی پر مجھے رشک آتا ہے۔ آپ ایم۔ ایس سی میں چلے گئے باجی بی۔ اے کر رہی ہیں۔ اس دن آپ دونوں کیسی فر فر انگریزی بول رہے تھے۔ میں منہ تک رہی تھی!!"

"عاشی بی بی۔ کوشش کرو۔" وہ اس کے گال پر تھپکی دے کر مسکرائے "تمھاری باجی تو بڑی نامی گرامی افسانہ نگار بھی ہیں۔ تم بھی اُن ہی کی سی ہو جاؤ ــ!"

"ارے ان کا کیا!!" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "بڑی قابل بنتی ہیں۔ سنیے ایک بات۔ مگر کسی سے کہیے گا نہیں۔ وہ جو گمنام صاحب ہیں نا!۔ بس! باجی ان کی تحریروں کو ہضم کر کے دوسری شکل میں اُگلتی ہیں۔ ہائے شنو بھیا۔ مجھے تو باجی پر ترس آتا ہے کوئی پرچہ مل جائے جس میں گمنام کی کہانی چھپی ہو۔ بس پھر دیکھیے۔ نہ وہ کھانا کھائیں گی نہ پانی پئیں گی۔ اپنے آپ کہانی پڑھتی رہیں گی اور آنسو بہائیں گی۔"

"کیا مطلب۔ عاشی بی بی ــــ؟!" وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولے۔

"میں کیا جانوں کیا مطلب ہوتا ہے!" وہ بڑا سا منہ بنا کر بولی "ڈھیروں رزق اکٹھا کر

رکھی ہے۔ بیکار کی۔ بکواس۔ اُن میں ہوتا ہی کیا ہے۔ مار کے محبت کی لن ترانیاں وہ اُن پر مر رہے ہیں۔ یہ اُن پر جان دے رہی ہیں۔ دونوں میں سچا کوئی بھی نہیں ہوتا ایک دوسرے کو ہمیشہ بیوقوف بناتے ہیں۔ چھی توبہ۔ میں تو ایسی چیزوں کو اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔"

شفقت متحیرانہ انداز میں اُسے گھور رہے تھے۔ عائشہ انھیں پکڑے گئی۔

"آئیے چلیں۔ ایسی اچھی ہوائیں چل رہی ہیں۔" اور انھیں برآمدے میں چھوڑ کر اپنا پرس لینے اندر بھاگ گئی۔

صالحہ لین چیر پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ شفقت کو دیکھ کر اس کے چہرے پر گلابی بکھر گئی۔ اور وہ کتاب میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو تین لمحوں تک وہاں سناٹا چھایا رہا تب صالحہ نے گھبرا کر کہا۔

"آپ نے یہاں سے ایک خط بھی اپنی خیریت کا نہیں بھیجا؟"

"تمہاری ساری ڈاک تو پابندی سے بھجوا دیتا تھا۔" انھوں نے جان بوجھ کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ اور زمین کو تکتے ہوئے بولے: "اور جہاں تک میں جانتا ہوں۔ میری خیریت ایسی ضروری نہیں ہے۔ کہ کسی کو اس کے جاننے کی آرزو ہو!"

"مجھے تو تھی!" اس نے بھی چپکے ہی سے کہا: "مگر آپ نے میری ڈاک کے پلندے میں ایک سطر بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر نہیں رکھی!" اس نے شکوہ کناں نظروں سے شفقت کو دیکھا اور اُن کو اپنی طرف دیکھتا پا کر پھر سر جھکا لیا: "معلوم نہیں آپ ہمیشہ غیریت کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟"

"غیریت؟" وہ آہستہ سے ہنسے: "میں نہیں سمجھتا صالحہ۔ جو لوگ یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس لفظ کا مفہوم بھی جانتے ہیں یا نہیں؟"

"خواہ مخواہ کی باتیں بنا کر آپ اپنا دل دُکھاتے ہیں۔" صالحہ کو جواب دینا نہ

آپا۔ ٹھیک ہے۔" انھوں نے کہا: "مجھے تم سے ایسی باتیں کرنی نہیں چاہئیں۔ میں کہنا
کچھ اور چاہتا ہوں۔ زبان سے کچھ اور نکلتا ہے۔ صالحہ! — تم تو افسانہ نگار ہو
انسانی جذبات اور احساسات پر تمہاری گرفت مضبوط ہے۔ تم جانتی ہی ہوگی کہ بعض
باتیں ایسی ہوتی ہیں جو محسوس تو کی جاتی ہیں مگر محسوس کرائی نہیں جاسکتیں!—"

"جی آپا!—" وہ سہم کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"بس یہی میری مشکل ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس پڑے۔ "معلوم نہیں کیا
کہنا چاہتا تھا اور معلوم نہیں کیا کہا!؟"

"ایسے از خود رفتہ نہ ہوا کیجئے!—"

"مجبوری بھی زندگی بن گئی ہے!—"

"کب تک بنی رہے گی؟—"

"کاش۔ اس کا جواب میرے بس میں ہوتا!!—"

اتنے میں عائشہ آگئی۔ اس نے بڑے خوش رنگ کپڑے پہن رکھے تھے۔ تتلی معلوم ہو رہی
تھی۔ شفقت خوش ہو گئے۔ "واہ۔ واہ بی بی۔ معلوم ہوتا ہے جیسے درخت میں
جان پڑ گئی ہو۔ نسترن جاگتی ہے۔—"

صالحہ بھی مسکرائی۔ "تم بہت نکھرنے لگی ہو—!"

"باجی۔ آپ بھی چپ رہیے۔ آخر کب تک پردہ اوڑھے رکھنے سے آپ کو کیا ملتا ہے؟"

"جو تمہیں نہیں ملتا!—"

"دیکھئے شفو بجیا۔ یہ بھی کوئی جواب ہوا—"

شفقت نے اس کی سفارش نہیں کی۔ اور صالحہ اپنی امی کے خوف سے ان کے
ساتھ جانے پر رضامند نہیں ہوئی۔

"جلدی آجائیے گا باجی ــــ!"

پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ عاشی! ــ" صالحہ نے کہا۔

صاحب۔!" اچانک ملازم نے دخل دیا۔ اور شفقت سے کہا: انعام صاحب آئے ہیں آپ کو بلا رہے ہیں! ــ"

اب آپ نہیں چلیں گے میرے ساتھ! ــ" عائشہ بگڑ گئی۔ کیسے بے تکے ہیں آپ کے دوست! ــ"

عاشی بی بی۔ میں انہیں بھگا کر ابھی تمہارے ساتھ جاتا ہوں" وہ ہنس پڑے۔ عائشہ بگڑ کر اندر چلی گئی۔ صالحہ وہیں بیٹھ کر پھر پڑھنے لگی۔

اس کا ذہن بکھرے بادل کی طرح چکرا رہا تھا! ــ نظریں کتاب پر تھیں اور دماغ کہیں اور۔ آج کتنے دنوں بعد اس نے شفقت کا چہرہ غور سے دیکھا تھا جس پر دکھوں کی پرچھائیوں کے سوا اور کچھ بھی صالحہ کو نظر نہیں آیا۔ وہ حساس اور خدایا بے پناہ حد تک تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

معلوم نہیں وہ کیا سوچتے رہتے ہیں! ــ تقدیر کا اجالا تمہیں مت نہیں۔ تمہیں احساس ہوگا۔ کہ تم کسی کے نہیں کوئی تمہارا نہیں۔ شفقت! میرا دل تمہاری ہمدردی سے لبریز ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ کچھ بھی نہیں کر سکتی تمہارے لئے!۔

وہ سوچتی رہی کڑھتی رہی۔

مغرب کے بعد وہ اٹھ کر اندر گئی۔ شفقت لمبے لمبے ڈگ بھرتے، اندر آرہے تھے! ــ انہوں نے بلند آواز میں عائشہ کو پکارا ــ عاشی چلو۔ ایک چکر بازار کا لگا آئیں! ــ"

نہیں چلوں گی اب میں آپ کے ساتھ! ــ جائیے آپ اپنے دوستوں کے مارے مارے پھرئیے:" عائشہ ریڈیو گرام پر بیٹھی تھی۔ گستاخ لہجے میں بولی۔ "جھنجھلاہٹ سے

گئے۔ صالحہ کو بے حد ناگوار ہوا۔ اس نے تلخ انداز میں کہا۔

"عائشہ تم بڑوں کی محبت میں ادب اور قرینہ بھول گئی ہو۔ ایسے لہجے میں بولتی ہو؟ کیا وہ مجبور ہیں تمھیں باہر لے جانے کے لئے۔ عائشہ۔ اٹھو معافی مانگو!"

"نہیں نہیں... صالحہ۔ ایسی کوئی بات نہیں۔!" شفقت نے جلدی سے کہا۔

"عائشہ؟!۔" صالحہ نے تادیبی لہجے میں پکارا۔

"معاف کر دیجئے۔ شفو بھیا! ۔ پھر کبھی نہیں کہوں گی!" عائشہ نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"بس کرو۔ آؤ چلیں۔!" انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ریڈیو گرام پر سے اٹھایا اور اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔

"مجھے ناگوار ہوتی ہیں ایسی باتیں۔" بیگم زیدی ناگوار انداز میں بڑبڑائیں "معلوم نہیں عائشہ کب تک بچی بنی رہے گی اور کب تک شفقت اسے بچہ بنائے رکھیں گے۔ ماشاءاللہ سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی۔ اور وہ بھی کوئی ننھے سے لڑکے نہیں ہیں!۔ میری کوئی سنے تب نا؟۔"

"امی۔ آپ تو عجیب باتیں کرتی ہیں۔ عاشی تو اُن کی گود میں کھیل کود کر بڑی ہوئی ہے۔!" صالحہ نے کہا۔

"کوئی کسی کے دل میں بیٹھا نہیں رہتا بیٹی۔ مجھے یہ حرکتیں اچھی نہیں لگتیں۔" صالحہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی!

بیگم زیدی ہر ماں کی طرح اپنی لڑکیوں کے مستقبل کے خیال سے پریشان رہتی تھیں۔ اُن کا بھی دل چاہتا تھا کہ صالحہ دُلہن بن کر اپنے گھر سدھارے۔ اسکی اعلیٰ تعلیم انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اب تو جہاں اس کی اعلیٰ تعلیم کا تذکرہ ہوتا بیگم زیدی کا قلب اُلٹنے لگتا۔ کتنے بہترین پیغام زیدی صاحب نے مسترد کر دئے تھے۔ اب تو بیگم یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی تھیں کہ زیدی صاحب کا دماغ ٹھکانے پر نہیں رہا۔ وہ کہتے کہ لڑکے کی کمی وہ لڑکی سے پوری کریں گے۔ وہ اس دن کا خواب دیکھ رہے تھے جب صالحہ اُن کی آرزوؤں کو پورا کرے گی۔ ایک بڑی ڈگری انھیں دکھائے گی اور ایک قابلِ رشک عہدہ اُسے ملے گا۔ تب کون کہہ سکے گا کہ زیدی صاحب لڑکے سے محروم ہیں۔ وہ صالحہ کی شادی کی بات سننا بھی پسند نہ کرتے!

بیگم زیدی کے بڑے بھائی زوّار حسین صاحب نے اپنے بیٹے کا پیغام صالحہ سے دیا تھا۔ جشیی ڈاکٹر تھے۔ بڑے معزز اور بے حد متحمل آدمی تھے۔ غرور اور تکبر سے کوسوں دور۔ اُن کی شرافت خوش مزاجی اور نیک نفسی صالحہ کو بھی پسند تھی۔ کبھی کبھار اُسے خیال آتا۔ شاید بابا جان یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ صالحہ لڑکی ہی ہے وہ لڑکا کبھی نہیں بن سکتی۔ جشیی کی بنس مکھ شکل۔ خوشنما انداز گفتگو، مسحور کن شخصیت اُسے متاثر کرتی۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی!۔

بیگم زیدی بھتیجے کی خوبیوں پر فریفتہ تھیں۔ انھوں نے زیدی صاحب کی ہزار خوشامد کی۔ دنیا کی اونچ نیچ سے ڈرایا۔ اپنے اور اُن کے بڑھاپے کا خیال دلایا۔ مگر وہ زیدی صاحب ہی کیا ہوئے جو مان جاتے!۔

گھر بھر ان کے خیر مقدم کو اکٹھا تھا! ۔ اور وہ سب کے سامنے بلند آواز میں روتی ہوئی کہہ رہی تھیں ۔

"ارے مجھے کون سی خوشی راس آئی ہے ۔ کیا کیا ارمان لے کر تمھارے یہاں پیغام بھیجا تھا ۔ میری پیاری بچی مجھ سے ہمیشہ کے لئے دور ہو گئی ۔ غیر کی لڑکی میری بہو بن کر آئے گی ۔ کیسے میں دل کو سمجھاؤں گی ۔ میں تو سوچ بیٹھی تھی کہ جیتی دلھن بن کر تمھارے ہی گھر جائے گی ۔ شمسہ بی بی یہ تمھارے میاں نے کیا کیا کلیجے میں ناسور ڈال دئے ! ۔"

جیتی سامنے ہی کھڑے تھے ۔ صالحہ بھی موجود تھی ۔ جیتی نے ایک نظر صالحہ پر ڈالی اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا ۔ صالحہ کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا دوسرا جا رہا تھا ۔

بھئی یہ کیا تعزیت شروع کر دی ! بھائی صاحب نے کہا اور شمسہ بیگم کو بوجی کے گلے سے جدا کیا ۔ وہ بھی آنسو پونچھ رہی تھیں ۔ گلوگیر لہجے میں بولیں ۔

" بھائی صاحب ساری زندگی تو ان کے ساتھ کٹ گئی ۔ مگر اب گزارا دشوار ہے ۔ انھوں نے میرے دل میں ناسور بنا دئے ہیں کوئی خوشی میری پوری نہیں کرتے ۔ آپ ہی دیکھئے جوان لڑکیاں آنکھوں کے سامنے موجود ہیں مگر انھیں کوئی پرواہ نہیں ۔ پیغام آتے ہیں اور وہ ٹھکرا دیتے ہیں ۔ کیا مجھے آرزو نہیں تھی کہ میری داماد آپ ہی کے یہاں آتی ! ۔"

انسان کے اعمال اور افعال خدا کی مرضی کے تابع ہیں ۔ شمسہ ! ۔ انھوں نے کہا ۔ جو ہونا تھا وہ ہوا ۔ مرضی اور خوشی ہماری بھی یہی تھی ۔ لیکن اشفاق میاں کے عالم میں کون بولے نہ معلوم کیا سوچتے رہتے ہیں ! "

صالحہ الگ کھڑی سر جھکائے بیٹھی تھی ۔ اس کا جسم بھاگ رہا تھا ! ۔ کیا

پتہ تھا کہ یہاں یہ خرافات شروع ہو جائے گی! جب بزرگ اپنی ہی دنیا میں گم ہو گئے تو چشتی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور شرمندگی مٹانے کے لئے عائشہ سے پوچھا۔

"بے بی۔ پھوپھا جان نہیں آئے تمہارے سب کے ساتھ؟"

"شاید یونیورسٹی میں کوئی کام تھا۔ چشتی بھیّا!" عائشہ کچھ گھبرا رہی تھی۔

"شفقت و حسب بھی نہیں آئے۔ کیا انھوں نے بھی بائیکاٹ کر رکھا ہے!" وہ ہنسے۔

"جی۔ امی نے انھیں گھر کی نگرانی کے لئے چھوڑ دیا تھا!" عائشہ بولی۔

"واہ بھئی" وہ ہنسنے لگے "چوکیداری کے لئے ملازم کافی نہ تھے!"

عائشہ چپ رہی۔ چشتی نے پھر کہا "یہ تو ناممکن ہے کہ دونوں حضرات اس موقعہ پر غائب رہیں۔ میں کل خود جا کر لاؤں گا!"

اتنے میں اُدھر چشتی کی چھوٹی بہن عصمت آگئی۔ اور اُن سب کو یہاں سے لے گئی الگ پہونچ کر صالحہ نے اطمینان کی سانس لی۔

"تم یہاں منہ کر آرام کر لیں" اُس نے کہا "رات کو مہندی اور ساچق میں چلنا ہے!"

چشتی کو ہنسی آگئی "میرا خیال ہے عصمت، انھیں ان لغویات میں نہ لے جاؤ۔ ایک اعلیٰ پایہ کی افسانہ نویس کو بھلا ان فضول باتوں سے کیا سروکار ہے؟"

"واہ بھائی جان" عصمت نے تنک کر کہا "افسانہ نویس ہیں تو باہر کے لئے۔ گھر کے اندر تو وہ ہماری سیدھی سادی صالحہ ہی رہتی ہیں!"

صالحہ خاموش بیٹھی رہی۔ چشتی کی موجودگی میں اُسے شرم آ رہی تھی۔ اُن کا پیغام اس کے لئے گیا تھا۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ دل میں!

"کچھ باتیں کرو بہن۔ ایسا بھی کیا" عصمت بولی "میں تو تڑپ رہی تھی تم سے ملنے کے لئے۔ خیال تھا کہ تم نہیں آؤ گی۔ ایک اونچی ادیب ہو"

باتیں کریں ۔ کس پیرایہ میں کریں ۔

چشتی ایک مضبوط دل سرجن تھے ۔ معلوم نہیں زندگی کی پلٹنیں گاہ پر کیسے کیسے ہولناک حادثے انھوں نے دیکھے تھے ۔ اُن کی زندگی خطرناک مریضوں کے درمیان گزری تھی ۔ کیا کچھ انھوں نے نہ دیکھا تھا ۔ مگر اس وقت صالحہ کی ہم نشینی نے طاقت گویا سلب کر رکھی تھی ۔ وہ اس کا چہرہ تک رہے تھے ۔ مبہوت اور دم بخود سے ۔ کاش زندگی کے طویل سفر میں وہی ہم سفر ہوتی ۔ کتنی پیاری ہے ۔ سفید چہرے ۔ سیاہ آنکھوں والی خاموش سی لڑکی ۔ انھوں نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر رُخ موڑ لیا ۔
اور جب خاموشی بے تکی ہونے لگی تو انہی نے پہل کی ۔ بڑی مشکل سے سوچ کر کہا ۔

" آپ بہت خاموش ہیں ۔ صالحہ ۔ شاید یہ سوچ رہی ہیں کہ یہاں آنے میں جو وقت برباد ہوا ہے ۔ اس میں آپ ایک کہانی لکھ لیتیں ! " یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگے ۔ بڑی دلکش ہنسی تھی جس نے محرومی کے جذبات صالحہ کے دل میں جگا دیئے ۔

جی نہیں ! اس نے سر جھکائے ہوئے کہا ۔ " میں یہ نہیں سوچتی ۔ دراصل میں لکھ سکتی ہوں بول نہیں سکتی ۔ مجھے بولنا نہیں آتا ۔ ! "

چشتی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ۔ " جی ہاں ۔ جی ہاں ۔ اکثر فنکار ایسے ہی ہوتے ہیں ۔ اُن کی زبان چپ رہتی ہے ۔ قلم بولتا ہے ۔ آنکھیں بولتی ہیں ! "

صالحہ خاموش رہی ۔ چشتی اٹھ کھڑے ہوئے ۔ اب تنہائی گراں گزر رہی تھی ۔ " آیئے چلیں ۔ آپ برسوں بعد ہمارے یہاں آئی ہیں ۔ آپ نے میرا یہ نیا گھر ہی نہیں دیکھا ۔ پچھلے حصے میں میں نے لفٹ لگوائی ہے ۔ آپ یقیناً پسند کریں گی ! "

" آپ بھی کبھی نہیں آئے ہمارے یہاں ! " صالحہ نے کہا ۔

" جی بس کیا عرض کروں مصروف بہت رہتا ہوں " ۔ چشتی نے کہا ۔ اُن کا لہجہ شائستہ انداز پاکیزہ اور گفتگو کا طرز بے حد شریفانہ تھا : " حال ہی میں لندن سے لوٹا ہوں ۔

خیال تھا کہ تھوڑے دن آرام کروں گا۔ مگر آرام کہاں کہ ایک لمحہ کی فرصت نہیں ملتی گاندھی ہسپتال میں تقرر ہوا ہے۔ صبح و شام مریضوں کی اتنی کثرت رہتی ہے کہ کچھ نہ پوچھئے:

"سب دل کے مریض ہوتے ہیں!" مالکہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ اپنے الفاظ میں یوں کہئے کہ سب دل کے بیمار ہوتے ہیں۔" چشمی نے اس کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ وہ شرما گئی۔

"خدا محفوظ رکھے۔" انھوں نے کہا: "بڑی خطرناک بیماری ہوتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیمار لاش میں تبدیل ہو جاتا ہے!"

"اللہ کی پناہ ۔۔۔!" مالکہ نے اپنے رخسار دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے: "کیوں یہ مرض اتنا عام ہوگیا ہے؟"

"مجھے ایسے لوگوں کو بہت ہوتا ہے۔" چشمی نے اپنی مسکراتی ہوئی نگاہیں مالکہ کے حسین جگمگاتے ہوئے چہرے پر جما دیں: "دل جو چاہے وہ نہ لے۔ بے چارہ ٹوٹ نہ جائے تو کیا کرے۔ ویسے بیمار پڑنے والے یہ نہیں سوچتے ہے

دل ٹوٹنے سے تھوڑی سی تکلیف تو ہوئی
لیکن تمام عمر کو آرام ہو گیا

وہ اور کیا کہتے۔ سب کچھ تو کہہ دیا اور ہنستے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ چشمت اس کے خیال سے جلد ہی اپنی مصروفیت میں کھو گئی اور مالکہ کو اپنا گھر دکھانے لگی۔ اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اپنی تقدیر پر آپ سے ہنسی آرہی تھی کیا دیا ہے زمانے نے اسے۔ اضطراب۔ حرماں نصیبی۔ محرومی۔ وہ لڑکیاں کتنی خوش نصیب ہوتی ہیں جو پڑھتی لکھتی نہیں۔ جن کو گھر بار ہوتا ہے۔ محبت کرنے والا شوہر۔ ہنستے مسکراتے بچے۔ سکھ اور اطمینان۔

عصمت کو سب کچھ میسر ہے۔ وہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ لیکن سکون و طمانیت اور مسرّت اس کے چہرے سے عیاں ہے۔ اس کے دل میں کوئی آگ نہیں لگی۔ کسی چیز کو پانے کی تمنا نے اُسے بے چین نہیں کر رکھا ہے۔ اس نے جو چاہا ہے وہ اُسے مل گیا۔ اگر نہیں ملا تو اپنا نام۔ اپنی شہرت۔ جس نے صالحہ کو کہیں کا نہیں رکھا۔ اس کی آنکھوں میں حسینی کی مسکراتی ہوئی شکل پھر رہی تھی۔ کیسے اچھے لگ رہے تھے سفید پاجامہ اور مانجھے کے زرد ریشمی قمیص میں۔ اُن کا شفاف بیداغ گندمی رنگ کیسا نکھرا ستھرا لگ رہا تھا! — بار بار مسکراتے ہوئے وہ کتنے دلکش لگ رہے تھے۔

کیا سوچ رہی ہو۔ صالحہ! — عصمت کی آواز نے اُسے گہرے خواب سے بیدار کر دیا: "جب سے آئی ہو مسلسل سوچے جا رہی ہو۔ ہم ایسے جاہلوں میں تمہارا دل نہیں لگ رہا ہے نا؟ — ہمارے سب کے احساسات تمہارے ایسے نازک نہیں ہیں۔ اور یہاں کوئی افسانہ نگار بھی نہیں ہے! —"

افسانہ نگار —" وہ طنزیہ ہنس پڑی: "بار بار مجھے طعنہ نہ دو عصمی۔ اسی منحوس عادت نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ تم خوش قسمت ہو۔ کہ میری طرح نازک اور سننی احساسات نہیں رکھتیں! —"

اتنی ناشکری نہ کرو صالحہ —" عصمت نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "تم پہ مجھے رشک ہوتا ہے۔ شہرت، عزت، ناموری اور اپنے پرستاروں کی ستائش کیا کچھ نہیں نہیں ملا۔ مجھے دیکھو۔ بی اے میں فیل ہوا غضب ہو گیا۔ امی نے زبردستی شادی کر دی۔ سسرال میں ایک لمحہ آزادی کا نصیب نہیں۔ اللہ میاں نے اپنی رحمت چار چار مورتیں نازل کر رکھی ہے۔ فراغت کی سانس لینے کو ترستی ہوں —"

"جسے جو نہیں ملا۔ وہ اس کی طلب میں تڑپتا ہے عصمت۔ مگر جسے خدا نے

جو بھی دیا ہے۔ سب تجھ کو دیا ہے۔" صالحہ نے کہا۔

اندر کہیں لڑکیوں نے گیت چھیڑ دئے تھے۔ اُن کے سریلے قہقہوں کا ترنم صالحہ کے دل میں انجانے جذبے جگا رہا تھا!۔ وہ بے حد اداس اور افسردہ ہو رہی تھی کتنی حسرتیں تھیں۔ کیسے اجنبی اجنبی احساسات تھے۔ جو دل کی گہرائیوں میں دبے دبے سسکیاں بھر رہے تھے!۔

"گیت گاؤ گی؟" عشمت نے ہنس کر پوچھا: "آخر تمھارے بھائی کی شادی ہے۔"

گیت نوحے بن گئے عشمت۔ اس کے لب ہلے مگر آواز نہ نکلی وہ چپ چاپ عشمت کے ساتھ چلی گئی۔

دالان میں سفید چاندنیوں کا لمبا چوڑا فرش بچھا تھا!۔ خاندان بھر کی لڑکیاں اکٹھا تھیں۔ کسی نے ہارمونیم سنبھال رکھا تھا کوئی ڈھولک بجا رہی تھی۔ اُن سب کے لبوں پر اچھوتے گیت تھے۔ چہرے وفورِ مسرت سے دمک رہے تھے۔ باسی پھولوں کی جذبات خیز مہک فضا میں چکراتی پھر رہی تھی!۔ اس کے دل میں جوار بھاٹے چلنے لگے۔ وہ خاموشی سے ایک گوشہ میں جا بیٹھی۔

"اوہو۔ صالحہ باجی" ایک لڑکی چہکی "ارے آپ کب آئیں۔ فرصت مل گئی آپ کو یہاں تک آنے کی!"

"کیا میں کہیں کی گورنر ہوں۔ بہت مصروف رہتی ہوں؟" وہ ہنس دی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" دوسری چہکی "جیسے بھنورا پھول پھول کا رس چتا ہے۔ جیسے شہد کی مکھی جگہ جگہ سے شہد اکٹھا کرتی ہے۔ ویسے صالحہ باجی بھی جگہ جگہ گھوم پھر کر اپنی کہانیوں کے پلاٹ جمع کرتی ہیں!"

"اس کی کیا ضرورت ہے" کوئی اور بولی "ان کا تو ذہن ہی اپنی الگ ایک دنیا ہوتا ہے۔ فنکار اپنے دماغ کا سیاح ہوتا ہے۔ کیوں صالحہ باجی؟"

معلوم نہیں : وہ اُکتا کر بولی ۔ تم لوگ اپنے اچھے اچھے گیت گاؤ ۔ افسانوں کی باتیں پھر ہوں گی ۔

اور پھر ہار مونیم بجنے لگا ۔ ڈھول پٹنے لگی ۔ سہاگ کے گیت فضا میں گونجنے لگے ۔ رات کو مہندی اور سانچق کی رسمیں ادا ہوئیں ۔ بڑی بیگم نے آسے بھی سمدھیانے جانے پر مجبور کیا تھا مگر وہ نہ مانی ۔ عائشہ تمام لڑکیوں کے ساتھ چلی گئی ۔ رات کا ایک بج رہا تھا ۔ چاندنی سوئی ہوئی کائنات پر پگھلی ہوئی چاندی لٹا رہی تھی ۔ چاروں طرف سناٹا تھا ! ۔ اس کے ذہن میں بھی سناٹا چھایا ہوا تھا ! ۔ وہ آرام کرسی پر لیٹ گئی اور افق کی چمکیلی سرحد پر نظریں جما دیں ۔

دالان میں عورتیں باتیں کر رہی تھیں ۔ اس کے کانوں میں بڑی بیگم کی کراری آواز آئی ۔ میں کہتی ہوں شمسہ بی بی ۔ تمہارے میاں کے دماغ میں شروع ہی سے نیچریوں کی خوبو بسی ہوئی تھی ۔ مذہب سے بیر ہے ۔ شاید ہی کبھی قبلہ رخ سر جھکایا ہو ۔ ہندو کو ہندو سمجھیں نہ مسلمان کو مسلمان ۔ انگریزی پڑھ پڑھ کے انگریز بن گئے ہیں ۔ کچھ ان کا ٹھیک نہیں کہ کب کیا کر بیٹھیں ۔ میں تو یہی سوچتی ہوں کہ اپنے سے دوسرے کرسٹان کے ہاتھ میں اپنی بچیوں سی بیٹیا کا ہاتھ نہ دے دیں ۔ آخر یہ یوں کھلا پلا کر پروان چڑھا رہے ہیں ؟ ۔"

بھابی جان ۔ بس ان کا خدا حافظ ہے !" بیگم زیدی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ۔

"کچھ پتہ نہ چلا ۔ لڑکے کے ماں باپ کون تھے ۔ کس مذہب کے تھے ؟"

بھابی کی بہن صاحبہ نے پوچھا ۔ "یہ کوئی بات کبھی اچھی نہیں کہ ماشاء اللہ جوان جہان لڑکیوں کے بیچ ہر وقت جوان مرد گھسا رہے ......"

کون منع کرے ؟ ... ؟ بیگم زیدی نے خود پر بے بسی طاری کر لی ۔ " میں تو دبائی

کوئی مصلحت ہوگی۔ ویسے صالحہ کو دیکھ کر سینے میں ہوک اُٹھ رہی ہے۔ کاش چشتی کی دلہن بن کر یہاں آتی! ــ"

وہ اسی قسم کی بکواس کرتی رہیں۔ صالحہ بالکل خالی الذہن سی آسمان کو تکتی رہی۔ چاند اپنے حسنِ کامل پہ نازاں مسکرا رہا تھا۔ اس کے جلو میں اکا دکا ستارے ہلکیں جھپکا رہے تھے۔ باغ میں پُر فسوں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

رات کے دو بجے لڑکیاں واپس آئیں۔ اور پھر ڈھولک لے کے حلق پھاڑنے لگیں۔ چشتی نے چائے کی فرمائش کی۔ عصمت چائے بنانے اٹھ گئی۔ صالحہ بھی جانے لگی مگر چشتی نے اُسے ٹھہرالیا۔

"کم از کم چائے تو سب کے ساتھ پی لیجیے۔ پھر آپ کی [illegible]" وہ اب بھی مسکرا رہے تھے۔ ایسی ناقابلِ فہم مسکراہٹ جو کہ [illegible] پیشانی پسینے [illegible]۔

نیند نہیں آئے گی! ــ" صالحہ نے مدھم آواز میں کہا۔

"کیا پرواہ ہے۔ باتیں کریں گے۔ یا پھر جو آپ کی مرضی! ــ"

وہ مجبوراً پھر بیٹھ گئی۔ عصمت چائے لے آئی۔ چشتی نے اپنے ہاتھ سے پیالی اُسے پیش کی اور معلوم نہیں کون کون سے موضوع چھیڑ دیے۔ کہ رات کے [illegible] تقریباً سب ہی جاگتے رہتے تھے! باتیں، قہقہے، لطیفے، گیت۔ زندگی پُر شباب تھی مگر صالحہ کو شدت سے احساس تھا۔ یہ سب عارضی تھا! یہ لوگ بچھڑنے ہی کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہی کنج قفس کی تنہائی۔ اور جتنی جاگتی محفل میں اُسے تنہائی کا احساس زیادہ ہونے لگا۔ وہ بھی سب کے ساتھ ہنس رہی تھی۔ اور یہ اُسی کو معلوم تھا۔ اس کے تبسم کے پیچھے غم کے کیسے زہریلے ناگ پھنکار رہے تھے! ــ

اس کی نظر اسی طرح چشتی پر پڑ رہی۔ کل وہ دو سرے وقت کے بجائے [illegible]۔ اور

کا تبسم اُن کے قہقہے سب کچھ فریب ہے۔ صرف بارہ گھنٹوں کے لئے۔ اور پھر سب کچھ پرایا ہو جائے گا!۔

فجر کی نماز کے بعد بڑی بیگم نے زبردستی سونے کے لئے بھیج دیا۔ حشمی بھی اُٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے دن شادی کی شرف رخصت رہی۔ حشمی نے گاڑی بھیج کر زیدی صاحب اور شفقت کو بلوایا وہ تو بھائی صاحب اور بڑی بیگم سے پناہ مانگتے تھے۔ مگر طوعاً و کرہاً آنا پڑا۔ اُن کے استقبال کے لئے باپ بیٹے دونوں گیٹ ہی پر کھڑے ہو گئے تھے۔ زیدی صاحب جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے وہیں اتر پڑے۔ اور شفقت مسکراتے ہوئے زاہد حسین صاحب سے بغلگیر ہونے کو جھجکے۔ بھائی صاحب نے انہیں بازوؤں میں جکڑ لیا

مبارک ہو۔ بھائی صاحب نے زیدی صاحب کو کہنا پڑا۔

"کیوں بھائی۔ یہ غیریت اور بیگانگی کیسی؟" انھوں نے شکایت کی: "تمھیں خاص طور پر بلوانا پڑا۔ حشمی تمھارا بیٹا نہیں ہے؟!"

دونوں باتیں کرتے ہوئے اندر چلے گئے۔ زیدی صاحب نے معذرت کی "نہیں جناب۔ یہ تو خیال بھی نہیں تھا۔ دراصل مصروف بہت رہتا ہوں!!"

"اپنے خاندانوں میں رہ کر کون کیا چاہتا ہے" بھائی صاحب نے کہا "اب اگر خوشی غمی کے موقعوں پر بھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہ رہیں تو پھر کون سا اپنا ہے جو خوشی اور دکھ کے وقت پر کام آئے۔ میں نے تمھاری غیریت بہت شدت سے محسوس کی ہے!"

"میں بہت شرمندہ ہوں بھائی صاحب!" زیدی صاحب نے کہا "دراصل میں نے نہیں سوچا تھا کہ میری غیر حاضری آپ کو اس قدر گراں گزرے گی۔ شمہ اور دلہا کو تو بھجوا دیا تھا!"

"بے شک بے شک ... مجھے ان دونوں سے انتہائی مہربانی کی [illegible]

تو انھیں بھی نہ بھجواتے۔ بھئی وہ تو بہن کے تعلق سے میری اپنی بچیاں ہوئیں۔ تم تو بھرا سر غیر ہو گئے!۔"

"آج رات کب روانہ ہو رہی ہے؟" زیدی صاحب نے جلدی سے پوچھا۔

بھائی صاحب کو ہنسی آ گئی۔ بڑی بے تکلفی سے اُن کی پیٹھ پر ہاتھ دے مارا اور دونوں ہنستے ہوئے مردانے میں چلے گئے۔

شفقت کو چشتی کا عطا کردہ اعزاز بے حد گراں گزر رہا تھا!۔ انھیں کنبہ بھر سے الگ تھلگ ہونے کا احساس بہت ستانے لگا تھا۔ بھلا اُن کی شادی سے انھیں کیا سروکار۔ وہ خوددار اور غیرت مند تھے۔ اور جانتے تھے کہ وہ مقام اور رتبہ عارضی تھا جو کسی کو رحم و ہمدردی کا مستحق سمجھ کر دیا جائے!!۔

چشتی انھیں لئے ہوئے اپنے دوستوں میں چلے گئے اور اطمینان سے بیٹھنے کے بعد کہا "مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں نے آپ کے لئے خاص طور پر کارڈ نہیں چھپوایا تھا غالباً ایسی چیز کو آپ نے محسوس کیا۔ اور ناگوار نہیں کیا ہے!!"

شفقت کو بے ساختہ ہنسی آ گئی: "آپ سمجھے نہیں۔ اگر ہم سب یکساں ہی جیتے آتے تو گھر پر کون رہتا!؟"

"جی ہاں جی ہاں۔ بجا فرمایا" چشتی نے کہا: "انسان کو خیال ہو جب دنیا بھر کی مصروفیتیں چھوڑ کر دوستوں کی خوشی میں شامل ہونے پہنچتا ہے۔!"

"اچھی بات ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا!" شفقت نے عاجزی سے کہا۔ چشتی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"آئندہ؟ کیا مطلب۔ میں کوئی بار بار شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں!"

"آئندہ؟" چشتی جانتے تھے کہ شفقت کو کس قسم کے خیالات مضطرب رکھتے ہیں۔ انھوں نے کبھی کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے اُن کا احساس قوی ہوتا۔ وہ ان

ایک دوسرے کو مدتوں سے جانتے تھے۔ بے تکلفی کی نوبت نہیں آئی تھی بہرحال شفقت نے انھیں بے حد پسند کیا۔ یہ سب کو ایک صف میں دیکھتا ہے۔ برتری اور کمتری کا خیال نہیں کرتا!

ہفتہ بھر کی اَن تھک مصروفیت کے بعد وہ سب واپس ہوئے۔

صالحہ نے کبھی اپنی ذات کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ مگر حشمی کی شادی سے وہ ایک نیا احساس لے کر اٹھی۔ وہ بھی خوبصورت ہے۔ اتنی حسین کہ ممانی جان ایسی سخت عورت بھی اس کی تعریف پر مجبور ہو گئیں۔ اور بھی بہت سے احساسات تھے۔ جنہوں نے اسے بہت خود پرست بنا دیا تھا۔ کوئی اسے بھی چاہ سکتا ہے۔ حشمی [illegible] اسے یاد آئی۔ وہ بھی اسے پسند کرتے تھے۔ خود اعتمادی نے اسے لاپروا بنا دیا۔

حالانکہ حشمی کی دلہن فردوس بہت اچھی لڑکی تھی۔ بڑی بیگم کی ہمیشہ یہ آرزو تھی کہ وہ اپنے لائق فائق بیٹے کے لئے شہزادی دلہن لائیں۔ موزوں و مناسب لڑکی کی تلاش میں حشمی کو بہت انتظار و صبر کی کٹھن منزلوں سے بھی گزرنا پڑا۔ مگر آخر انہیں میٹھا پھل ملا۔ صالحہ فردوس کے حسن سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ اس نے کئی ایک روپ میں اسے دیکھا تھا۔ جب فردوس اپنے ماں باپ کے گھر سے وداع ہو رہی تھی۔ اس کے آنسو [illegible] چمکیلی افشاں اسی طرح گالوں پر چمک رہی تھی۔ جیسے ستارے جھلمل جھلمل کر بکھر رہے ہوں۔ گلابی گلابی نرم نرم ہونٹ کانپ رہے تھے۔ جسم پھولوں بھری ڈالی کی طرح جھکا جا رہا تھا۔ مسرت [illegible] میں ڈوبی چنچل چلبلی سی لڑکی چند دنوں میں میکے سے سسرال آئی۔ اور جب صالحہ نے اس کا چہرہ دیکھا تب وہ دنگ رہ گئی۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ کوئی روتے ہوئے بھی اتنا حسین نظر آتا ہے۔

اور پھر دوسرے دن اس نے فردوس کو دیکھا۔ وہ اس کے [illegible]

معلوم نہیں ماں باپ سے جدا ہو کر فردوس پر اس رات کیا گزری۔ اُسے ساری
رات نیند نہیں آئی مگر جب اس نے صبح کو دیکھا تو نکھر رہ گئی۔ اس کا حسن انوکھا تھا
آنسو مسکراہٹوں کے پھول بن گئے تھے۔ رات کی اداسی، دکھ اور بے بسی کا کہیں نام
و نشان نہیں تھا۔ اب تو اس کی پیشانی سے فخر و ناز جھلک رہا تھا! جیسے وہ ایک خوبرو
شریف، دولت مند اور پڑھا لکھا شوہر کو پا کر خود کو کچھ سمجھنے لگی تھی!۔

ملاحت کو اپنے پچھلے خیالات پر افسوس ہونے لگا۔ وہ سمجھتی تھی وہ فردوس کے لئے اتنی پریشان
تھی!۔ یہ لڑکیاں کتنی بڑی اداکار ہوتی ہیں۔ ہنسنا رونا خوش رہنا اور اداس ہو جانا
سب کچھ ان کے اختیار میں ہوتا ہے۔ دوسروں کو بیوقوف بنانے میں مہارت رکھتی ہیں کیا
پتہ۔ جب وہ دوسروں کو اُلّو بنا کر آنسو بہانے پر مجبور کرتی ہیں تب دل ہی دل میں کیسے
قہقہے لگاتی ہیں!۔

بیگم زبیری واپسی پر بے حد دلگرفتہ تھیں۔ دل برداشتگی اُن کے چہرے سے
عیاں تھی اور ایسی بھی نہیں تھی کہ یہ بری طور پر نظر انداز کر دی جاتی۔ ملاحت کو یقین تھا کہ
یہ رنج و غم اُسی کی ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ خود بخود شرمندہ تھی۔ اور سوچ رہی
تھی کہ ہر باپ کی طرح اُسے کبھی کہیں اپنے گھر بار کا کر کے کیوں نہیں بابا جان امی کی
خوشنودی کا بندوبست کرتے؟ آخر نجمہ اسے بار بار محسوس ہونے لگی۔ جتنی زیادہ زبیری
صاحب کوشش کرتے کہ وہ ایک بے حد ناموزوں ہستی ہے۔ اُسی قدر ملاحت کو ہنسی
آتی! ـ کیا کرے گی وہ پڑھ لکھ کے؟ پھر وہی اس کا اپنا گھر ہوگا۔ شوہر بچے ـ
خانہ داری کی مصروفیت۔ دن ہی ہوگا کہ مصروف ہو کر رہ جائے گی کچھ برسوں کی نہ خبر
ہو جائے گی اور بس۔

عائشہ البتہ بے فکر تھی اسے اس قسم کی کوئی دکھ نہیں پاتا تھا کہ خواہ مخواہ
پریشان ہوتی پھرتی!۔ وہ تو بڑی بہن کا مذاق اڑاتی "باجی یہ جو دن کا کام ہے کہ باؤ

کاغذ پر ڈھیر کر کے آپ ردّی پر ردّی کا انبار لگا رہی ہیں تو آخر اس سے فائدہ ہی کیا ہے؟"

"تم نہیں سمجھو گی۔ بی بی۔ تم بالکل جاہل ہو!"

اچھا آپ بتائیے۔ یہ باتیں آپ نے کہاں سے سیکھی ہیں؟۔ یہ محبت وحبت۔ مجبوری بے چارگی اور الا بلا۔ آپ کی کہانی میں نے پڑھی تھی۔ وہ مجبور انسان کہاں ہے جس کی خاموش محبت کا قیامت خیز خاکہ آپ نے کھینچا ہے!"

"کہیں نہیں۔ کہاں ہوتا؟"

"تو کیا جھوٹے بھی اتنا پُر اثر ہوتا ہے باجی کہ انسان کو رُلا دے۔"

ان سب کا تعلق قلم کی زبان سے ہے۔ عاشی۔ میں اپنی لکھی ہوئی چیزیں پڑھتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کون سا احساس میرے ذہن میں ایسا ہے جس نے مجبور کر کے یہ سب کچھ لکھوا دیا ہے۔"

"یہی تو بات ہے کہ آپ ہر سال امتحان میں فرسٹ ان فرسٹ رہتی ہیں۔ سوال کے جواب میں بہت کچھ آپ دماغ سے لکھ لگا دیتی ہوں گی۔ بے چارہ ممتحن مرعوب ہو جاتا ہوگا۔"

"تم کیا جانو۔ بیوقوف ہو۔ بہاروں کی رنگینی، کہکشاں کی جگمگاہٹ، پھولوں کی نکہت اور کائنات کا سارا حسن اچھی تحریر میں پنہاں ہوتا ہے۔ کیسی انوکھی ہوتی ہے۔ تحریر کی مسرت۔"

ملازمہ کمرے میں آئی۔ اور کہا کہ دونوں کو بیگم صاحب بلا رہی ہیں!۔ وہ اٹھ گئیں۔ رات کے کھانے پر زیدی صاحب کے چند دوست آرہے تھے۔ بیگم زیدی کچن میں مصروف تھیں۔ سہ پہر ڈھلنے لگی تھی۔

بیٹی۔" انھوں نے صائمہ سے کہا۔ "تم دو ایک چیزیں تیار کر لیتیں۔ میرے سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں کھانے بابا کے دوست آجائیں گے۔!"

"بیکار کی باتیں سوچ سوچ کر آپ نے خود کو پریشان کر لیا ہے امی۔" صالحہ جی کڑا کر کے بولی، "دو نکمے والے ایک معمولی سی بات کو بھی اس قدر بڑھا چڑھا کر خوفناک انداز میں پیش کرتے ہیں کہ آدمی کو ڈرا دیتے ہیں!"

"ہٹو تم کیا جانو۔ میرے کلیجے میں تو پنکھے لگے رہتے ہیں۔ دل اُڑا رہتا ہے۔ خدا دشمنوں کو بھی تمہارے باپ سا باپ نہ دے۔ پڑھنا لکھنا غارت گیا جی کا جنجال بنا ہے۔ معلوم نہیں۔ شہرت اور ناموری کے کون سے تھپیڑ دیں آسمان پر تمہارے باوا جان تمہیں بیٹھا دیں گے۔ وہ لڑکیاں سب سے زیادہ خوش قسمت ہیں جو پڑھی لکھی نہیں ہیں!"

"اوہ۔ آسمان تو تعطلات عدد ہیں۔" عائشہ مسمسی صورت بنا کر بولی۔ "آپ نے بارہا ہمیں آسمان بخش دیے ہیں!"

"فضول بکواس نہ کرو۔" وہ کمزور لہجے میں آہستہ سے ڈانٹ کر بولیں۔ "تم جو کر دیوانہ وار کچھ لیتیں۔ گنتیں بھی ... رکھ دیا میں تو اب جو کر لیٹوں گی۔ کہیں جی نہیں لگتا!" یہ کہہ کر وہ پلنگ سے نکل گئیں۔

صالحہ تو دوپٹہ مروڑ کر بدستور ملازم عورتوں کے ساتھ کام کرنے لگی۔ اور عائشہ اپنے کام نمٹانے چل دی۔

تھوڑی دیر بعد زیدی صاحب بھی آگئے۔ بے حد خوش نظر آرہے تھے۔ ایک تنقیدی نظر ادھر ادھر ڈالی۔ اور مسکرا کر بولے۔ "بھئی واہ۔ کیسے سلیقے سے سب کچھ سجایا ہے۔ یہ پھول کس کی پسند سے آئے ہیں؟"

اب کیا یہ بھی انجان بنے رہے ہیں۔ بیگم زیدی نے جل بھن کر سوچا۔ خود ہی تو لائے تھے۔ وہ کچھ نہ بولیں۔ زیدی صاحب ان کے پاس آ بیٹھے۔

"کیا کر لیا یکا ڈالا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت تھک گئی ہو۔ بھئی بڑا اچھا ہوا کہ پرانے دوست بیٹی سے کرا گئے ہیں۔ کل بلاوہ نہ میرے دوستوں کی تھی۔ آج تو ادا کرنے

لگے کہ ہم بھی دعوت لیں گے۔ ورنہ میں ہرگز تکلیف نہ دیتا۔!"

"خدا کی شان ہے کہ میری تھکن بھی آپ کو محسوس ہو رہی ہے!" وہ بے رخی سے بولیں۔

"اوہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خفا بھی ہو۔ کوئی قصور کیا ہے میں نے؟"

"آپ کا کیا قصور۔ جب میری ہی قسمت خراب ہو۔"

"بھئی ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ ورنہ میرا بھی دل دعوت وغیرہ میں نہیں لگے گا۔"

"کیوں نہیں لگے گا۔ یہی تو آپ کی زندگی کا مقصد ہے۔ کہیں دعوت کھائیے۔ کسی کی دعوت کیجئے۔ ہنسی مذاق ہو۔ جوان لڑکوں کے سے قہقہے لگیں۔ پھر اپنے سب سے بڑے فرض سے آنکھیں پھیر کر اطمینان کی نیند سو جائیے۔ فکر تو مجھ لفیبوں جلی کے حصے میں آئی ہے۔"

"دیکھو بیگم۔ پھر تم نے عورتوں کی سی واہیات باتیں شروع کر دیں۔" وہ گھبرا کر بول پڑے۔ "میں سب جانتا ہوں کہ تمھیں بھائی صاحب اور بھابی صاحبہ نے بندوق کی طرح حلق تک بھرا ہے اور تم وقت موقعہ دیکھے بغیر مجھ پر چھٹ جاتی ہو۔ تم ایک سمجھدار خاتون ہو۔ تمھارا مقصد ایک روشن خیال عورت کی طرح یہی ہونا چاہیئے کہ جو میری مرضی وہ تمھاری مرضی۔ آخر میں کچھ نہ کچھ سوچتا ہی ہوں گا۔ بے فکری کی نیند میں کبھی نہیں سوتا۔ تمھیں کیا خبر کہ میرے ذہن میں کیا کچھ لاوے نہیں پکتے۔ شمسہ!۔ مجھے خدا نے اولاد نرینہ نہیں دی۔ میں چاہتا ہوں کہ میری لڑکی ہی لڑکے کے روپ میں ڈھل جائے۔ کچھ خواب میں نے دیکھے ہیں۔ صالحہ ان کی تعبیر مجھے بخشے گی۔ وہ میری تمناؤں کے خاکے میں رنگ بھر رہی ہے تم چاہتی ہو کہ میں اس کی شادی کر دوں۔ اس کے بعد میری زندگی میں کیا رہ جائے گا۔ وہ اپنے گھر بار کی ہو جائے گی بشوہر کی! ناز بردار ہ۔

بچوں کی خدمت۔ اور بس۔ وہ ایک عام عورت بن جائے گی! کیا آپ یہی چاہتی ہیں۔ بیگم!"

"ہاں۔ میں یہی چاہتی ہوں۔" بیگم نے کہا: "آپ صالحہ کو نابغہ عورت بنانا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ نہ وہ کوئی نادرہ روزگار عورت بنے گی نہ عام عورت کے معیار پر پوری اُترے گی۔ نہ اِدھر کی رہے گی نہ اُدھر کی۔ میری مانئے۔ یہ خبط دل سے نکال ڈالئے۔ بھائی جان نے فرینڈس کے بڑے بھائی کا تذکرہ کیا تھا!۔ وہ لاٹ پڑھ رہے ہیں اگلے برس پریکٹس شروع کر دیں گے۔ میں نے بھائی جان سے کہہ دیا تھا ——— کہ آپ سے پوچھ کر خط لکھ دوں گی۔!"

"کیلوں سے خدا بچائے بیگم۔" زیدی صاحب نے کہا: "وہ اپنی محبت کا خزانہ بیوی پر خالی کر دیتے ہیں!۔ تم سمجھی نہیں ہو کہ ......!"

"اب میں سب کچھ سمجھ گئی۔ آپ حیلے بہانے ہی کئے جائیں گے۔ میری بچی کی قسمت میں معلوم نہیں کیا لکھا ہے۔!"

"بیکار رہم کرتی ہو۔ ارے ابھی کون سی اس کی عمر بڑھی جا رہی ہے۔" زیدی صاحب زچ ہو کر بولے: "دیکھا جائے گا۔ دو تین برس بعد۔!"

اتنے میں عائشہ کمرہ صاف کر کے باہر آئی۔ صالحہ چائے لے کر آ گئی۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ زیدی صاحب نے ناگوار انداز میں پیالی اٹھائی۔

دفعتہً کال بیل گونج اٹھی۔ زیدی صاحب نے ملازم لڑکے سے کہا۔

"شفقت میاں سے کہو۔ باہر دیکھیں کون ہے!۔"

ملازم لڑکا باہر بھاگا اور ایک سکنڈ بعد واپس آیا: "صاحب باہر نہیں ہیں کار۔ ایک صاحبزادے نیلی کوٹھی سے آئے ہیں!۔"

"میرا پاؤں ہی سُن ہو گیا ہے۔ اُٹھ نہیں سکتا۔" انھوں نے کہا: "عائشہ ۔۔!

"بی بی تم دیکھتیں کہ کون ہے۔؟"

نیلی کوٹھی؟۔ وہ جو عائشہ کو شروع سے پسند تھی۔ اس کے مکین عائشہ کے لئے پرتسکین تھے۔ وہ پیالی رکھ کر اٹھی اور باہر مڑ گئی۔

پھر پر نہ سرکایا ہی تھا کہ دم بخود رہ گئی۔

اگر جلد ہی اپنے پر قابو نہ پاتی تو چیخ پڑتی۔ اس کے سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا جس نے ابھی پچھلے سفر پر اسے خاصہ پریشان کر ڈالا تھا۔ اور وہ کئی دنوں تک اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

وہ بھی کچھ کم حیران نہیں تھا۔ پہلے تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکا! گھورتا رہا عائشہ ہی سنبھلی اور لہجہ تلخ بنا کر بولی۔

"آپ؟ آخر گھر کا پتہ چلا لیا۔ کیوں آئے یہاں تک؟"

"جی... میں نہیں سمجھا۔ آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" وہ گھبرا کر بولا۔ "میں تو سامنے والے گھر میں رہتا ہوں۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ آپ کا گھر ہے"

"تو پھر کیوں آئے؟ آپ کون ہیں؟"

"میں آپ کا ہمسایہ ہوں۔ مجھے فرحان محمد کہتے ہیں۔ تھوڑی سی روشنی مانگنے آیا ہوں آپ سے!"

"کیا مطلب؟"

"کل رات کی بارش میں بجلی کے تار خراب ہو گئے ہیں! آج مکینک نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر نہیں آیا۔ ممی کی طبیعت رات ہی سے ناساز ہے۔ اگر آپ کل تک کے لئے کنکشن دے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی!"

"ٹھہرئیے۔ میں بابا جان سے پوچھ لوں!" وہ اندر بھاگ گئی۔ اور زیدی صاحب سے سارا قصہ کہہ سنایا۔

"وہ اگر میرے سامنے مکمل پسند کریں تو مجھے بے پناہ خوشی ہو گی۔ میری ممی کو دوبارہ زندگی مل جائے گی۔ آپ نہیں جانتیں کہ ہم لوگ کتنے رنجیدہ اور دکھی ہیں!" فرحان نے کہا اور عائشہ نے اس کی آنکھوں میں نمی تیرتی دیکھی۔ اس کا غصہ اور چڑچڑا پن رحم و مروت کے جذبات میں کھونے لگا۔

"جی ہاں۔ باجی چونکہ بہت بڑی فنکار ہیں۔ اور لوگ بے حجابا انھیں دیکھ نہیں سکتے شاید یہی وجہ ہے کہ آپ انھیں دیکھ کر حیران رہ گئے اور دوبارہ دیکھنا چاہتے ہیں!"

جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے" فرحان نے کہا "میں تو جانتا بھی نہیں کہ وہ بہت بڑی فنکار ہیں! ہمارا غم تو دوسرا ہے!!"

عائشہ!" دفعتہً اندر سے زیدی صاحب نے بلند آواز میں پکارا۔ وہ فرحان سے گفتگو کرنے میں مگن تھی۔ یکبارگی اچھل پڑی۔

دوسرے لمحے زیدی صاحب خود باہر آ گئے۔ عائشہ انہیں خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ فرحان نے بڑے ادب اور تعظیم سے انہیں جھک کر سلام کیا۔

اوہو۔ بیٹے تم ہو۔ اب کیسی ہے تمہاری امی کی طبیعت؟" زیدی صاحب نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر پوچھا پھر [illegible] بولے: "میں سمجھا تھا کوئی اور آیا ہو۔ تم اندر چلے آئے ہوتے۔"

وہ خاموش رہا۔

"بیٹی۔ یہ تو ہمارے نئے ہمسائے ہیں۔ فرحان کے والد [illegible] صاحب میرے بڑے گہرے دوست ہیں۔ تم شاید پہلی بار ملی ہو!" زیدی صاحب نے کہا عائشہ کے جی میں آئی کہ وہ کہے۔ "اس سے پہلے بھی شرفِ دیدار حاصل ہو چکا ہے" مگر

وہ چپ رہی۔

فرمان اپنا کام ختم کر چکا تھا! وہ دونوں کو سلام کر کے رخصت ہوا۔ پھر زیدی صاحب کے دوست آ گئے۔ عائشہ اندر آئی۔

صالحہ اپنے تازہ افسانے پر نظرِ ثانی کر رہی تھی! — عائشہ اس کے پاس جا بیٹھی۔ اور بے حد رازداری سے بولی۔

"باجی۔ کچھ آپ کو معلوم ہے۔ وہ جو پچھلی مرتبہ ٹرین میں ایک لڑکے نے گھور گھور کر پریشان کیا تھا نا؟ — وہ —!"

"ہمیشہ بچپنے کی باتیں کرو گی عائشہ! —" صالحہ نے ناگوار لہجے میں کہا "بھلا اس لڑکے میں کیا سرخاب کا پر لگا تھا! —"

"وہ ہمارا پڑوسی ہے" عائشہ نے کہا۔ "اور ایک سسپنس سناؤں آپ کو۔ وہ ابھی اپنے ہاں سے واٹر کا کنکشن لینے آیا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا تو اچھل پڑی —"

"بے حد سنسنی خیز سسپنس ہے —!" صالحہ نے طعن سے کہا "آج تک کہیں پڑھا نہ سنا"

"باجی میں جو اس سے ڈر رہی تھی۔ وہ صحیح تھا۔ آج اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ آپ کو گھور رہا تھا! — اور آپ سے اس کا المیہ وابستہ ہے! —"

"کیا بک رہی ہو —" صالحہ نے اُسے گھور کر کہا۔

"باجی میں غلط نہیں کہتی —" عائشہ نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا "کبھی آپ اُس سے ملیں تو خود ہی پوچھ لیجئے گا! —"

"بس بہت ہو چکی" صالحہ نے ناخوشگوار لہجے میں کہا "اب تم بیٹھ کے پڑھو۔ تمہاری پچھلی رپورٹ بھی تسلی بخش نہیں تھی! —"

"پڑھ ہی سکتی تو رونا کس بات کا تھا! —" عائشہ بولی اور منہ لٹکا کر بیٹھ رہی۔ صالحہ نے اس کی طرف سے پیٹھ پھیر لی اور ریڈیو کے سوئچ پر جھکتی ہوئی گنگنانے لگی۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ سردی تیز تھی۔ زیدی صاحب دوستوں کی گپ شپ سے اُٹھ کر آئے تو بہت تھکے ہوئے تھے۔ بیگم زیدی نماز پڑھ کر آئیں دونوں دالان ہی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکیاں سو چکی تھیں۔ ملازم کافی لے آیا۔ شفقت باہر سے آئے اور بیگم زیدی سے کہا کہ اُن سے ملنے کے لئے کوئی پردہ نشین خاتون آئی ہیں! —

"مجھ سے ملنے؟ —" بیگم زیدی نے حیرت سے کہا: "اس وقت۔ رات کے دس بجے؟ یہاں تو تمہارا کوئی ملنے والا نہیں —" زیدی صاحب نے بھی تعجب سے کہا۔

"پتہ نہیں۔ میں دیکھتی ہوں —" بیگم زیدی اُٹھ [illegible] دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ اور بجلی جلا کر دروازہ کھولا۔

نووارد خاتون آگے بڑھیں اور نقاب الٹا۔ [illegible] ہلکی سی چیخ نکلی —

"شمسہ؟ —" اور بڑھ کر اُن سے لپٹ گئیں۔

"یا اللہ..... زہرہ بہن۔ تم —" بیگم زیدی نے [illegible] ہو کر کہا: "اس وقت رات کے دس بجے کہاں سے آئی ہو۔ خیریت تو ہے؟۔ کہاں [illegible] —"

"میرے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں تھا۔ بہن کہ [illegible] ورنہ [illegible] تو آپ سے بہت پہلے آتی۔ آج تو مجھے فرمان نے ایک اشتہار دکھایا تھا —" زہرہ بیگم نے حیرت سے معمور انداز میں کہا "وہ تیرہ برس پہلے تمہارے یہاں سے لوٹ کے گیا تھا۔"

"اچھا۔ مجھے پتہ نہیں —" شمسہ بیگم کھلی پڑ رہی تھیں "فرمان۔ تمہارا بچہ ہے

گی کہ میری شبنم خاک کے پردوں میں چھپ گئی ہے۔ اللہ کی شان۔ وہ تو میرے سامنے ہے۔"

یہ کہہ کر وہ از خود رفتہ ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں صالحہ کا چہرہ تھام لیا اور آنسوؤں کی چلمن سے اسے دیکھنے لگیں۔

"میرے اللہ۔ یہی تو چاند سا چہرہ تھا۔ ایسی ہی ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ ایسے ہی نازک گلابی ہونٹ تھے۔ میری بچی۔ میری شبنم! میں تمہیں پہچان لوں گی۔ سچ ہے۔ جب فرمان نے مجھ سے کہا تھا کہ ممی میں نے اپنی شبنم کی سی شکل دیکھی ہے تو مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ یہ کیسی مشابہت ہے۔ میرے خدا۔"

بیگم زبیری دم بخود تھیں۔ صالحہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا! یہ سب کیا تماشہ تھا۔ اس نے ان کی آغوش میں کسمسانے کی بھی ہمت نہیں کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سنبھلیں اور صالحہ کو لئے ہوئے صوفہ پر آ بیٹھیں۔ اور آہ بھر کر بولیں۔

"شبنم۔ اولاد کا غم بھی برا ہوتا ہے۔ مجھے ابھی تک صبر نہیں آیا۔ اس وقت بھی میں تمہیں پہچان گئی۔ حالانکہ وہ مجھے روک رہے تھے کہ صبح کو چلی جانا۔ مگر مجھے قرار کہاں۔ اب میرے دل کو سکون آیا ہے۔ جب آیا کروں گی۔ اپنی بچھڑی بیٹی کی خوبصورت شکل دیکھ جایا کروں گی!۔۔" یہ کہہ کر انہوں نے صالحہ کی پیشانی پر پیار سے بوسہ دیا۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنی پر نم آنکھوں سے لگا لیا۔

عائشہ جو ابھی تک دروازے پر کھڑی تھی یہ منظر دیکھ کر اندر بھاگ گئی۔ اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ بیگم امتیاز کیوں اتنی مضطرب تھیں اور کیوں فرمان بار بار صالحہ کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

زبیری صاحب نے اس سے پوچھا "کون ہیں؟ کون ہیں وہ محترمہ کس لئے تمہاری امی سے ملنے آئی ہیں؟"

عائشہ نے انھیں سارا واقعہ سنا دیا۔

"اُف وہ۔ خدا کی پناہ۔ ہاں مجھ سے امتیاز بھائی نے کبھی تذکرہ کیا تھا کہ اُن کی جوان سالی لڑکی کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ بہت چاہتے تھے اُسے۔" زیدی صاحب نے کہا۔ پھر خود ہی کچن میں گئے۔ بڑی پُرتکلف چائے بنائی۔ ٹرے میں بہت سے لوازمات سجائے اور عائشہ کے ہاتھ سے باہر بھجوا دیئے۔۔۔"

اس نے سر جھکا کر انھیں سلام کیا اور ٹرے میز پر رکھ دی۔ بیگم امتیاز نے اس کے گال چھوئے اور بہت سی دعائیں دیں۔

"یہ عائشہ ہے۔" بیگم زیدی نے کہا۔

"بڑی پیاری ہے۔" بیگم امتیاز بولیں۔ "بہن دونوں کو میری طرف بھیج دیا کرو۔ میں تو ترستی ہوں لڑکی کے لئے۔ دل ناسور بنا ہے۔ کچھ تو مجھے بھی قرار آئے۔"

"کل سے یہیں رہیں گی۔" بیگم زیدی نے چائے بنا کر دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو رہ رہ کر افسوس ہو رہا ہے کہ میں پہلے ہی تم سے نہ ملی۔ ان لڑکیوں کے ابا بھی باہر امتیاز بھائی سے ملے ہوں گے۔ مگر مجھ سے نہیں کہا۔"

"اچھی میری بچی۔ اب تم جاؤ۔ میں نے تمھیں پریشان کر دیا۔" بیگم امتیاز نے مڑ کر اسے پچکار کر کہا۔ "جاؤ سو جاؤ۔ اللہ تمھیں بڑی عمر دے۔ صاحب نصیب کرے۔ کل مجھ سے ضرور ملنا بیٹی۔ اللہ تمھیں اس کا اجر دے گا۔ میں بڑی بدقسمت ہوں۔"

"آپ کے پاس میں ضرور آؤں گی۔" عائشہ نے چپکے سے کہا۔ اب سارا معاملہ وہ سمجھ گئی تھی۔ اُسے بیگم امتیاز پر بے پناہ ترس آ رہا تھا۔ اگر وہ غموں کی ماری نہ ہوتیں تو وہ کیوں آدھی رات کو دوڑی آتیں۔ جب وہ ان کے گلے سے لگی تھی تب محسوس کیا تھا کہ اُن کا جسم گرم تھا اور ہاتھ جل رہے تھے۔ مگر کیسی بے پایاں تڑپ تھی کیسی بے قراری تھی۔ بیمار ہونے کے باوجود دوڑی آئی تھیں۔ کتنا غم دیا تھا شبنم نے انھیں۔۔۔

وہ اُن کی شکل کو دیکھتی رہ گئی۔ بے حد اداس چہرہ۔ حلقوں میں ملتی ہوئی آنکھیں پژمردہ لب۔ نہایت کمزور اور مضمحل معلوم ہو رہی تھیں۔

رات کے لگ بھگ بارہ بجے وہ باغ کی راہ سے نیلی کوٹھی واپس گئیں۔ اور سب کو ایک ساتھ غم اور خوشی کے احساسات دے گئیں۔

بیگم زیدی اندر آئیں۔ اور زیدی صاحب پر برس پڑیں "بڑے اچھے ہیں آپ۔ اب باتیں چھپانے بھی لگے۔ مجھ سے اتنا بھی نہیں کہا کہ زہرہ بہن ہمسائے میں آکر رہی ہیں۔ وہ بے چاری بھی اپنے میاں کی شاکی تھیں۔ ایسی بلک کر صالحہ کو گلے سے لگایا ہے کہ میرے تو آنسو نکل آئے۔ اللہ کسی کو جوان اولاد کا داغ نہ دے بے چاری ایسے ناوقت دوڑی آئیں۔ آپ سے تو امتیاز صاحب نے کہا ہوگا کہ اُن کی جوان بیٹی کا دو ڈھائی مہینے ہوئے انتقال ہو گیا ہے!۔"

امی۔ آپ کس سے کہہ رہی ہیں!۔" عائشہ نے ٹوکا۔" باباجان تو سو رہے ہیں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنی خوابگاہ کی طرف چلی گئیں۔

دوسری صبح انھوں نے خاص کر لڑکیوں کو بیگم امتیاز سے ملنے بھجوایا۔ وہ انھیں اپنے یہاں دیکھ کر بے پناہ مسرور ہوئیں۔ صالحہ کا تعارف امتیاز احمد سے کرایا۔ وہ بھی اُسے دیکھ کر بڑے متعجب ہوئے۔ رنج و غم کے سائے بھی ان کے سنجیدہ چہرے پر لہرائے انھوں نے صالحہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بے شمار دعائیں دیں۔ اور زہرہ بیگم سے بولے

کیا خدا کی شان ہے۔ زہرہ۔ ایسی عجیب مماثلت تو ہم نے کہیں دیکھی نہ سنی۔ اللہ نے میری تسلی کا سامان کر دیا ہے۔" وہ صالحہ کو دیکھ کر پیار سے بولیں۔

"اب تو میں اسے اپنے سے جدا نہیں کروں گی۔"

فرمان کرسی کی پشت تھامے بڑی حسرت سے صالحہ کو دیکھ رہا تھا! ۔ چپکے سے پوچھا آپ کو میں اپنی کھوئی گئی۔ اب برا تو نہیں مانیں گی ۔۔۔!"

مجھے تو بے حد خوشی ہوگی۔ تم میرے چھوٹے سے بھیا ہو۔" نائلہ نے کہا۔

بیگم امتیاز نے انھیں بڑی لذیذ چائے پلائی اور پھر فرمان سے بولیں۔

"جاؤ انھیں اپنا گھر دکھاؤ۔ پہلی مرتبہ تمہاری بہنیں تمہارے گھر آئی ہیں۔"

"آئیے چلیں —" فرمان حکم کی تعمیل میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس کے پیچھے ہولیں۔ عائشہ کو اس کا گھر بہت اچھا لگا۔ لمبے لمبے شاندار ستون۔ شفاف برآمدے۔ خوشنما فرش۔ بہترین ریشمی کامدار پردے۔ نرم نرم قالین۔ آرائش و زیبائش کا عمدہ سامان۔ مسہری بڑے تخت جن پر نفیس بیڈ شیٹ بچھے ہوئے تھے۔ دیوار و در کا نیلا رنگ۔ تو پورا گھر گویا کہ عجیب سی پُراسرار رومانیت بخش رہا تھا۔

فرمان نہایت شوق اور دلچسپی سے انھیں ایک ایک چیز دکھا رہا تھا۔

"اس میں ڈیڈی رہتے ہیں۔" اس نے ایک بڑے سے سجے سجائے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "پاس والا کمرہ ممی کا ہے۔ آپ کو پتہ ہے نا — وہ اُدھر والا کمرہ میرا ہے۔ میں اپنے دروازے پر پردہ نہیں ڈالتا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ جب میں سونے لیٹتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی پردے کے پیچھے چھپا کھڑا ہے —"

"اتنے ڈرپوک ہو آپ۔" نائلہ ہنسنے لگی۔

"جی ہاں۔ دیکھئے نا۔ ڈر تو لگتا ہی ہے۔" وہ انھیں ایک بڑی خوبصورت لائبریری میں لے آیا۔ "یہاں ڈیڈی بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ مگر میرا دل نہیں لگتا —"

"اف وہ — اتنی ساری کتابیں! —" عائشہ سہم گئی۔ "تمہارے ڈیڈی پڑھتے ہیں یہ ساری کتابیں!؟ —"

"ساری ساری رات —" وہ مسکرایا۔ "میرا تو بالکل جی نہیں لگتا!" —

"کیوں بھئی —!" نائلہ نے پوچھا۔

"کیا کروں، پڑھ کر کے —" وہ دونوں کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ اس طرف

کہ اس کا شانہ صالحہ کے شانے سے چھو رہا تھا۔ کوئی احساسِ اجنبیت و تکلف کا نہ رہا تھا
"میں سوچتا ہوں — یہ سب بے کار ہے۔ دنیا سے دلچسپی۔ بہتر سے بہتر جینا، زندگی
کے لئے ترسنا۔ سب فضول ہے۔ جب موت آتی ہے تو بس آ ہی جاتی ہے۔ وہ بڑے
چھوٹے امیر غریب جاہل و عالم کسی کو نہیں دیکھتی۔ بس اُسی طرح ہمیں اُچک لے
جاتی ہے جیسے خونخوار بھیڑیا بکری کے بچے کو دبوچ لے جاتا ہے!— خون چوس لیتا ہے
اور پھر دوسرے شکار کی تلاش میں نکلتا ہے!—"

"اُف توبہ — کیسی بھیانک باتیں کرتے ہو؟" عائشہ نے حیران ہو کر کہا۔
"میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں!—"

"خدا کرے کہ آپ کبھی نہ سوچیں۔ مجھ جیسے والے کبھی خوش نہیں رہ سکتے!" وہ
سب کے ساتھ صوفوں پر بیٹھ گیا اور خیال میں ڈوبا ہوا غمزدگی کے لہجے میں بولا۔ "مگر میں
اس لئے سوچتا ہوں کہ میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ "ہم سب امی کی ہستی کو تھامے رہے
تھے مگر موت کے آہنی پنجے نے بڑھ کر انہیں ہم سے چھین ہی لیا! پتہ نہیں..... کیسے
میری تو پلکیں ہی جھپک گئی تھیں۔ میں نے کبھی انہیں مردہ نہیں سمجھا۔ اب بھی نہیں
سمجھتا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دو دن پہلے کی چلتی پھرتی ہستی اچانک مر جائے!"

"کیا ہوا تھا تمہاری امی کو فرحان؟" صالحہ نے جھجک کر پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ کسی کی سمجھ میں ان کا مرض نہیں آیا۔" اس نے کہا۔ "مرنے سے
دو دن پہلے تک بالکل اچھی تھیں۔ ایک شام کالج سے واپس آیا تو بڑی کمزور
لگ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا تو پتہ چلا کہ انہیں خوب تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ سانسیں
اتنی تیزی سے چل رہی تھیں کہ ان کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ڈیڈی نے فوراً
بہترین ڈاکٹروں کو اکٹھا کر لیا۔ میں نے بہت دعائیں کیں۔ مزار، گھر

عزیزوں سے بچھڑ گیا۔ سب بیقرار تھے۔!"

اُس نے رُک کر ہتھیلیوں میں اپنے آنسو سمیٹے اور گلوگیر آواز میں بولا: "دو راتیں دو دن اپّی بے سُدھ پڑی رہیں۔ ممی ان کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ڈیڈی کا بے تاب تھے۔ اور میں ___ میں تو اپّی کے بستر کے گرد پھرتا تھا۔ کاش ان کی بیماری مجھے آ جاتی۔ مگر کوئی کسی کا دُکھ بانٹ نہیں سکتا۔ ایک دن اپّی نے بہت چپکے سے آنکھیں کھولیں۔ میں آپ سے کیا بتاؤں کتنی بے بسی اور اذیت تھی اُن کی آنکھوں میں۔ ہم سب خوش ہو کر اُن پر جھک گئے۔ ممی نے اُن کے ہونٹ چوم لیے۔ ڈیڈی نے ان کے رخسار تھام لیے۔ میں نے اُن کی پیشانی پر سر رکھ دیا۔ سب انھیں آوازیں دے رہے تھے۔ سب کہہ رہے تھے کہ بس اب بیماری کا دور ختم ہوا۔ بخار ٹوٹ گیا۔ اپّی کو صحت ہو جائے گی۔ مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ اپّی نے ایک بے معنی نظر ہم سب پر ڈالی۔ معلوم نہیں کہ ہم انھیں دکھائی بھی دیے یا نہیں۔ انھوں نے چپکے سے ایک سانس لی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

اس کے ساتھ وہ دونوں آنسو بہانے لگیں۔ نہ سمجھا سکیں نہ بہلا سکیں۔

"اپّی مجھے کتنا چاہتی تھیں۔ شاید ان کی محبت میں اسی لیے اتنی شدت تھی کہ وہ جلد ہی مجھ سے جدا ہونے والی تھیں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ میں ایک دن کے لیے بھی اُن سے الگ نہیں رہا۔ کچھ دنوں کے لیے پڑھائی کے واسطے شملہ چلا گیا تھا۔ ہوسٹل میں رہنا تھا۔ لیکن ایک ہفتہ بھی نہیں رہ سکا!۔ دن کو جیسے تیسے کٹ جاتا تھا تو راتوں کو بستر پر پڑا جاگتا رہتا تھا!۔ ہوائیں چلتی تھیں تو ایسا لگتا تھا جیسے میدانوں سے پہاڑوں سے درختوں سے جھاڑیوں سے چاروں طرف سے اپّی مجھے پکار رہی ہوں۔ میں رو دیتا تھا!۔ پڑھنے میں میرا دل نہیں لگتا تھا! میں واپس

بھاگ آیا۔ گھر پہنچا تو ممی نے مجھے سینے سے لگالیا اور بتایا کہ اُن کا بھی یہی حال تھا
ممی — !" پھر بے حد محبت پاش لہجے میں صالحہ نے کہا: "اب صبر کرو۔ تم جتنے
آنسو بہاؤ گے۔ اتنی ہی تمہاری اپی کی روح کو تکلیف ہوگی۔ بھیا۔ وہ اب واپس
تو نہیں آئیں گی۔ دیکھو۔ تمھیں میں مل گئی ہوں۔ میرا بھی کوئی بھائی نہیں تھا۔
اب تم مل گئے ہو۔ ہم تم بہن بھائی کی طرح عمر بھر ساتھ ساتھ رہیں گے — !"
کچھ دیر بعد وہ سنبھل گیا۔ اور کوئی بات یاد کرکے خفیف سی مسکراہٹ سے بولا
"ممی اُن کے غم میں بیمار ہوگئی تھیں تو ڈیڈی انھیں اُوٹی لے کے چلے گئے۔ وہاں قریب
قریب ایک مہینے رہ کر واپس ہوئے تو ایک اسٹیشن پر میں ممی کے لئے پانی لینے اترا
اچانک میری نگاہ آپ کے ڈبے کی طرف اٹھ گئی۔ اپنی اپی کی سی ایک شکل دیکھ کر مجھ پر
میرا کیا عالم ہوا۔ میں بے چین ہوگیا۔ اور ہر اسٹیشن پر اتر اتر کر میں آپ کو دیکھتا
رہا۔ معلوم نہیں آپ نے کیا سوچا تھا کہ ایک بار میں اترا تو کھڑکی بند تھی۔ میں مایوس
ہو کر پلٹ گیا۔ پھر بھی میں اس اُمید پہ آتا رہا کہ شاید اپنی بہن کی صورت دیکھنے کو مل
جائے۔ مگر آپ نے کھڑکی نہیں کھولی۔
مجھے کیا معلوم تھا۔ فرمان۔" صالحہ نے کہا: "اگر مجھے پتہ ہوتا کہ میں تمہاری بہن سے
اتنی ملتی جلتی ہوں تو میں خود اپنے درجے سے اتر کر تمہارے پاس آجاتی۔"
غلطی میری ہی تھی — !" اس نے کہا: "مگر میں ڈر رہا تھا۔ جس طرح میں آپ
کو دیکھ رہا تھا اس طرح بدمعاش بھی تو گھورتے ہیں!" وہ مسکرایا: "آپ نے مجھے
یہی سمجھا ہوگا شاید!!"
نہیں تو — !!" صالحہ نے کہا۔
ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ نارمل ہوگیا۔ صالحہ نے محسوس کیا۔ وہ بڑا ہی
تمیزدار اور شریف تھا۔ ایک بات بھی اس نے تہذیب و شائستگی سے گری ہوئی نہیں

میں جاؤں۔ ممی۔۔۔ ہے۔" صالحہ نے اس طرح پوچھا کہ بیگم امتیاز کے
دل میں آنسوؤں کا چراغ جلا دیا۔ وہ اس کی اس ادا پر بے چین ہو گئیں۔ سر سے
پیر تک بلائیں لے کر سینکڑوں دعائیں دیں۔ منہ سے بات نہیں نکلی۔ آنکھوں سے
خون بہنے لگا۔

"اب میں آپ ہی کے پاس رہوں گی۔ ممی۔۔۔" صالحہ نے اپنے آنچل سے
اُن کے آنسو پونچھے: "رو دیجئے۔ یہ سمجھئے کہ آپ کی شبنم آپ کو پھر واپس مل گئی ہے!"
بیگم امتیاز نے مجبور ہاتھ سے رکھ کر پاس رکھا ہوا صندوقچہ کھولا۔ ایک قیمتی
موتیوں کا ہار نکالا اور صالحہ کے گلے میں پہنا دیا۔ اُن کی آنکھوں میں اتنا خلوص
تھا کہ صالحہ کے لبوں سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ اُس نے ان کے سامنے سر جھکا دیا۔

واپس آئی تو کالج کا وقت ہو رہا تھا۔ جلدی جلدی کھانا کھایا اور لباس
تبدیل کر کے باہر آئی۔ عائشہ بھی تیار تھی۔ دونوں گاڑی کے قریب پہنچی تھیں کہ
لان پر شفقت دکھائی دیئے۔ آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے باہر جا رہے تھے!۔۔۔

"پکارو انھیں نا ممی۔ کہاں جا رہے ہیں؟" صالحہ نے کہا۔ عائشہ نے انھیں
آواز دے دی۔ وہ ادھر ہی مڑ گئے اور خاموش خاموش سے آ کر کھڑے ہو گئے۔

صالحہ کا ادب اُن کا لحاظ بہت کم ہونے لگا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اُن سے اجتناب
کرتی تھی۔ اس وقت ان کے قرب سے اس کا دل دھڑکنے لگا!۔۔۔ اُس نے اپنے
خشک لبوں پر زبان پھیری اور اس کے ہونٹوں کی گلابی جھلک اٹھی۔

شفقت گم صم تھے۔ حالانکہ وہ انھیں ایک طویل عرصہ سے جانتے تھے۔ کوئی
تکلف حجاب اور غیریت ان میں نہیں تھی۔ مگر اس وقت انھیں محسوس ہوا کہ ۔۔۔
نا قابلِ فہم احساس کی ایک بلند ترین ناقابلِ عبور و تسخیر چٹان دونوں کے درمیان
حائل ہے۔ پھر اُن پر اپنا اور صالحہ کا مقام واضح ہوا۔ وہ یونیورسٹی کے ذہین کی

متمول نہ عزز لڑکی ہے اور وہ خود — ایک تمسخرانہ مسکراہٹ اُن کے لبوں پر بکھر گئی۔

جب دس منٹ تک وہاں بے تکی خاموشی چھائی رہی تو عائشہ نے بڑی معصومیت سے کہا "آپ نے شفقت بھائی کو کیوں بلایا تھا باجی۔ کہتے کیا کہنا چاہتی ہیں ؟ —"

"یا اللہ یہ اتنی پاگل ہے۔" صالحہ نے شرمندہ ہو کر سوچا اور جھینپ کر شفقت کو دیکھنے لگی۔ اُن کی نظریں صالحہ کے چہرے پر پڑیں اور وہ کوشش کے باوجود اپنی ہنسی نہ چھپا سکے!۔

سبز قیمتی لباس میں بیٹھی۔ گلاب کا تر اور پھول کان کے پاس لگائے۔ وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔

"کچھ کہنا ہے مجھ سے ؟! —" وہ ہولے سے مسکرائے۔ اور زمین کو تکنے لگے۔

"جی ہاں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ — کہ دیکھئے۔ سردی اتنی زیادہ ہے۔ آپ نے کوئی گرم کپڑا نہیں پہنا —"

"مجھے نہیں لگتی سردی —!"

"آپ کی طرف سے باجی کو لگ رہی ہے۔ لہٰذا سوئٹر پہن لیجئے۔" عائشہ بولی اور احمقانہ انداز میں ہنسنے لگی۔

"جاؤ اندر کمرے سے سوئٹر لے آؤ!" صالحہ نے کہا۔ عائشہ چلی گئی۔ شفقت نے تعجب سے اُسے دیکھا اور مسکرائے۔

"بہت زیادہ سوچنے والے اسی طرح احساس سے بیگانہ ہو جاتے ہیں! — کیوں آپ اتنی غیریت برتنے لگے ہیں۔ دکھانے پر آتے نہ چائے پر رہتے ہیں۔ کچھ کہا ہے امی نے ؟ —"

"نہیں تو ۔۔۔!"

"تو پھر کیا بات ہے؟" کسی کے کہنے سننے کا اثر لے لیا ہے اتنا شدید۔ کہ اب
اپنی شکل ہی کسی کو نہیں دکھاتے۔"

"شکل اس قابل بھی تو ہو کہ کسی کو دکھائی جا سکے! ۔۔"

اب الٹا سیدھا فلسفہ بگھارنے لگا۔" وہ بگڑی۔" مجھے پتہ ہے۔ امی نے کچھ کہہ دیا
ہے بس وہی آپ کو برا لگا ۔۔۔ ہے نا؟ ۔۔"

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل۔ شام سے میری طبیعت
خراب تھی۔۔۔"

"بس بہانہ کرنے لگے۔ میرا تو بہت جی چاہتا ہے کہ آپ اپنی تمام ضرورتیں مجھ سے
کہہ دیں کیا میں کچھ بھی نہیں کر سکتی آپ کے لئے ۔۔؟"

"تم چاہو تو میری تقدیر بدل سکتی ہو۔" انھوں نے بے آواز کہا۔

"واپسی پر میں آپ کے لئے اون لیتی آؤں گی پچھلا سوئٹر بھجوا دیجئے گا۔ پیمائش
کے لئے۔ اچھا؟ ۔۔"

شفقت کو ہنسی آگئی۔" اتنی نوازشیں کرو گی میرے حال پہ۔ بے وجہ ہی۔ پھر اگر
تمھاری نگاہیں پھر گئیں تو زمین آسمان میں کوئی پرساں حال نہ رہے گا۔"

"کیوں پھریں گی نگاہیں۔ میں ایسی طوطا چشم نہیں! ۔۔"

عائشہ سوئٹر لے آئی۔ حکم کی تعمیل میں شفقت نے سوئٹر پہن لیا اور پھر گیٹ کی طرف
قدم بڑھائے ۔۔"

"آئیے گا۔ ساتھ ساتھ چلیں! ۔۔" صالحہ نے کہا۔ اور بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑ
لیا۔" ہم کو ڈراپ کر کے یونیورسٹی چلے جائیے گا! ۔۔"

"نہیں صالحہ" ان کی پیشانی پسیجنے لگی " مجھے اپنی راہ پر جانے دو ۔۔!"

مگر اُن کی ایک نہ چلی۔ عائشہ نے بھی مجبور کیا۔ انھیں ساتھ جانا پڑا۔ راستے
بھر تینوں خاموش رہے۔ سب کی فکریں الگ الگ تھیں۔ گاڑی جب ڈینس کالج کے گیٹ
پر رُکی تو صالحہ اور عائشہ اتر گئیں اور یکبارگی صالحہ نے جھک کر شفقت سے پوچھا۔
"سچ بتائیے۔ آپ آج اتنے افسردہ کیوں ہیں۔ کیا سوچتے رہتے ہیں۔ مجھ سے بھی
نہیں بتائیے گا؟ —"

"صالحہ — !" وہ بے چین ہو گئے۔ کتنی گہری نگاہیں تھیں جو صالحہ کی نگاہوں سے
مل گئی تھیں شعلوں میں گھری ہوئی۔ وہ گھبرا گئی۔ اور سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ گاڑی
اسٹارٹ ہو کر آگے چل دی۔ اور وہ کئی لمحوں تک وہیں کھڑی رہی! —

اُس دن صالحہ کا دل نہیں لگا۔ اردو پیریڈ سے اُسے بڑی شغف تھا۔ کیسے دلنشین
پیرایہ میں مسز الطاف اقبال کو سمجھاتی تھیں کہ وہ از خود ذہن نشین ہو جاتی تھی۔ آج اُن کے
پیریڈ میں بھی کوئی حسن باقی نہیں رہا تھا۔ بریک میں وہ پارک میں جا بیٹھی۔

اس کی بہت سی ساتھیاں لان میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ پتہ نہیں اُن میں کونسا
دلچسپ موضوع چھڑا ہوا تھا کہ بار بار قہقہے لگ رہے تھے! — صالحہ کو دیکھ کر اُن کی ہنسی
تیز ہو گئی۔ حامدہ نے آہستہ گدگدا کر کہا۔

"اچھا تو اتنی جلدی ہم سب سے آزردہ ہو گئے۔ ٹھیک ہے بھئی۔ نیا سودا ہے پیارے!
دو دن — اب جی کر کیا کریں گے جب دل ہی ٹوٹ گیا —"

لڑکیوں نے ہنس کر داد دی۔ صالحہ جل کر بولی: "فضول بکواس کر کے منہ سوگی۔ تم
لوگوں میں ذرا بھی تمیز نہیں۔ کہلاتی ہو۔ بی۔ اے سینیئر کی طالبہ! —"

"اگر تم کہو تو نہ کہلائیں!" — رضیہ نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"آدمی کی حیثیت دیکھ کر جوتے پیدا کرو" — رضیہ نے بزرگانہ انداز میں بتایا۔ "تم
دیکھ رہی ہو کہ تم ہو بہت آگے زیدی۔ اے ون افسانہ نگار۔ اس وقت گفتگو کے

بابِ پنجم کا مطالعہ فرما رہی تھیں!" —

صالحہ نے اس پر کتاب پھینک ماری — رفیعہ نے بڑے آرٹسٹک انداز میں کتاب کھینچ لی اور شاعرانہ سلام کرتی ہوئی بولی۔ "عزت افزائی کا شکریہ — بڑے آدمی اپنی تعریف سن کر غریبوں کو اسی طرح نوازتے ہیں! — زہے نصیب!" —

"میں پوچھتی ہوں — یہ آج سودا کیا سوار ہوا ہے؟" — صالحہ نے حیرت سے ایک ایک کو دیکھ کر پوچھا — جواب میں وہ بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگیں! —

صالحہ جھنا گئی "معلوم ہوتا ہے — دماغ ہی الٹ گئے ہیں — اور یہ تم کیا بک رہی تھیں رفیعہ — گلستاں کا باب پنجم — کیا مطلب ہوا اس کا؟" —

"مطلب تو خود ہی کو نہیں معلوم — البتہ غالب کے ایک مشکل شعر کو تمہاری گاڑی میں بیٹھا دیکھا تھا شب کو — !" نعیمہ شمسی صورت بنا کر بولی —

"گاڑی میں غالب کا شعر؟" — زیبا نے حیرت سے پوچھا —

"جی ہاں — کھینچ کر بتاؤں — سرخ قمیض اور کتھئی سوٹ میں — !!" نذیرہ نے گردن دھلکا کے کہا — "آنکھوں پہ سیاہ چشمہ! — اسے میں نے آنکھیں پھاڑ کر ساتھیوں سے پوچھا کہ بوا یہ کیا ہے — اس پر یہ سب ان کی نانی خالائیں اور بچیاں سب مل کر بولیں کہ تم نہ ہو غالب کا شعر ہے جیسے ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی بام میں اور رنجانے کیا کہ صالحہ زیدی نکلیں ہمارے ہاتھ سے !!" —

"بیہودہ بکواس کا کہیں علاج نہیں — نذیرہ!!" — صالحہ نے دانت پیس کر کہا "جھینپ تم نے میری گاڑی میں دیکھ لیا وہ بابا جان کے کسی دوست کے بیٹے ہیں — مدتوں سے ہمارے یہاں رہتے ہیں — ان کی حیثیت میرے بڑے — بھائی — کی سی ہے سمجھیں! —

من خوب می شناسم — !" بخمہ نے آدھ کر کہا۔

"بابا جان کے . . . . . کے بیٹوں میں تو نہایت الٹی کو الٹی کا جارم ہوتا ہے!

"مجھے تم سب کی ذہنیتوں پر نہایت افسوس ہوتا ہے" صالحہ نے سنجیدگی سے کہا: "تم لوگ غریب ماں باپ کی بیٹیاں ہو۔ اعلیٰ گھرانوں سے تمہارا تعلق ہے۔ روشن خیال ہو سفید پوش ہو۔ مگر تمہارے دماغوں کی گھٹن اونچی تعلیم بھی نہ مٹا سکی۔ بظاہر تم پاکیزگی چہروں سے کیوں نہ ہویدا ہو۔ مگر باطن وہی ترسا ہوا دل ہے جو کبھی غیر شکل کو دیکھ کر رال ٹپکایا کرے۔"

لڑکیوں کے چہروں پر ندامت و خجالت کے آثار نمودار ہوئے۔ عالمہ نے بات بنائی: "بھئی تم تو خفا ہو گئیں۔ اری باتیں تو اپنوں سے ہوتی ہی رہتی ہیں!۔ برا مانا ہو تو معاف کر دو۔ پھر نہیں کریں گے!"

صالحہ نے برا سا منہ بنا کر رخ پھیر لیا۔ ایک ایک کر کے وہ سب اٹھ کر چلی گئیں اکیلی مالکہ بیٹھی رہی۔ اس نے صالحہ کا موڈ خراب دیکھ کر اس کی پسندیدہ گفتگو چھیڑ دی۔

"اب کی تازہ پرچے میں تمہاری کہانی۔ پڑھ کے جی روند لگیا۔ بڑی غضب کی ہیں تو ملے ہی ہیں! ایک بار دوسرے کی مدد چاہ رہی تھی۔ میں سچ مچ جھوم جھوم گئی۔"

"پتہ نہیں کیوں" صالحہ جلدی سے بن گئی: "مجھے وہ اب بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ جب میں دیکھتی ہوں کہ مجھ سے زیادہ اچھے لکھنے والے بھی موجود ہیں!۔ تم نے نجمی گل نام کو نہیں پڑھا؟"

"پڑھا تو ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ جذبات و احساسات کی عکاسی جس طرح عورت کر سکتی ہے۔ ویسے مرد نہیں کر سکتا!۔ ان کی تحریروں میں ایک کرختگی سی ہوتی ہے جیسے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے جائیں۔ پتہ نہیں کون ہیں۔ ان کی بس ایک کہانی مجھے اچھی لگی تھی: دل کا نقاب۔ جس میں دکھایا تھا کہ ایک بے چارہ آدمی کس امیرزادی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ جس کی خبر اس لڑکی کو کبھی نہیں ہوتی اور وہ خود بھی یہ حقیقت باور کرنے کو آمادہ نہیں ہوتا۔ بے یقینی تذبذب اور گومگو کی ایسی کیفیت آ،

طاری رہتی ہے۔ جیسے اس نے خود ایک دبیز نقاب اپنے دل کے چہرہ پر ڈال دیا ہو بعد کو جب پتہ چلا تو غریب موت کے دہانے پر تھا: ـــ"

"میرا بہت جی چاہتا ہے۔ نائلہ ـ میں اُن سے ملوں۔ مگر پتہ نہیں کہاں رہتے ہیں:"

"یہ معلوم کرنا کیا دشوار ہے۔ سحر نو کے ایڈیٹر کو خط لکھ کر پتہ منگوالو" نائلہ نے کہا:۔

"ڈر لگتا ہے ـــ" صالحہ نے کہا: "اگر وہ اپنی ظاہری شخصیت کے برعکس نکلے تو ـــ؟ نہیں نائلہ۔ نہ میں انھیں خط لکھ سکتی ہوں نہ مل سکتی ہوں کیونکہ میں اپنے باپ کا آدرش ہوں۔ وہ مجھے بےلوث بےغرض اور بےنفس دیکھنا پسند کرتے ہیں!۔ اور یہ لاگ بھی ـــ اگر کوئی شخص مجھ سے ملنے گھر پر چلا آیا تب۔؟ کتنا صدمہ ہوگا بابا جان کو۔ وہ چاہے زبان سے کچھ نہ کہیں مگر دل میں ضرور سوچیں گے کہ صالحہ اپنی ذات سے تنہا نہیں اُس سے کوئی متعلق بھی ہے۔ بھیا! پیار کس میں اپنے بارے میں سننا نہیں چاہتی!"

"تمہارا اصلی کردار کہاں ہے۔ صالحہ وہ جو سحر نو کی کہانی کا ہیرو ہے۔ مجبور بےبس اور اپنے آپ سلگتا ہوا ـــ"

صالحہ نے نفی میں سر ہلایا: "وہ میرے ذہن میں پوشیدہ ہے۔ اگر وہ دماغ کی دنیا سے باہر آئے گا تو ساری دلکشی کھو بیٹھے گا! ـــ"

"مجھ سے بھی جھوٹ بولوگی؟ ـــ" نائلہ ہنسنے لگی!۔

"کیا مطلب؟ ـــ" صالحہ نے تعجب سے پوچھا۔

"کچھ نہیں! ـــ" نائلہ نے جھٹ سے بات بدل دی: "اچھا وہ جو صبح کو تمہارے ساتھ تھے اُن کا نام کیا ہے ـــ؟"

"شفقت حسین! ـــ" صالحہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ "اچھا تو یہ بات تھی۔"

نائلہ نے جھینپ کر کہا: ”ارے اب نام پوچھنا بھی کوئی بات ہونے لگی؟“ —

”میں غائبانہ تمہارا تعارف کرا دوں گی۔ خوش ہو جائیں گے!“ — نائلہ نے سوچا کہ وہ ویسے ہی بے وقوف بن رہی ہے۔ اب اُسے بھی جوابی کارروائی کرنی چاہیے۔ ”کہہ دوں گی نائلہ روز آپ کی بہت تعریفیں کر رہی تھی۔ آپ کے حسن جہاں سوز نے اسے پھونک کر خاکستر بنا ڈالا ہے! — کچھ تو رحم کیجئے بے چاری پر۔“

”بہن ایسا کرو تو احسان کرو مجھ پر۔ زندگی بھر نہ بھولوں گی!“ — نائلہ بولی اور خواہ مخواہ ہنسنے لگی۔ — نائلہ بھی ہنس دی۔ مگر وہ شکر گزار تھی۔“

بیگم امتیاز اپنی پرانی سہیلی کیا ملیں کہ وہ دنیا و مافیہا کو بھول گئیں۔ انھوں نے زیدی صاحب سے گمان پردہ نہیں کیا۔ صبح سویرے ہی چلی آتیں۔ اور سارا دن بیگم زیدی کے ساتھ گزارتیں۔ فرمان اور عائشہ بچپن سے گہرے ساتھی بن گئے تھے۔ بیگم امتیاز نے صالحہ کو مانگ لیا۔ وہ تو اس کی صورت دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ صالحہ کو ان کے غم اور محرومی کا احساس تھا۔ اس نے کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے ان کو افسوس ہوتا کسی نے اس کے نیلی کوٹھی جانے پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ صالحہ وہاں رہتی اور فرمان زیدی صاحب کے یہاں۔۔۔!

بیگم امتیاز اس عرصہ میں بیمار رہی تھیں۔ غم انگیز تنہائی نے انھیں زندہ درگور کر رکھا تھا۔ فرمان سے چھپ چھپ کر آنسو بہاتیں۔ دکھ کا گھن انھیں اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا تھا۔ جینا ان کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ اب تو انھیں فرمان کی فکر تھی کہ اگر خدا نے انھیں بھی سمیٹ لیا تو فرمان کیسے جئے گا؟ ۔۔۔ وہ سولہ سترہ کے لگ بھگ بے حد ناسمجھ اور معصوم لڑکا تھا۔ فرمان کا کوئی غم گسار نہیں تھا۔ ماں کے ساتھ ہی رونے لگتا تھا۔ اس سے انھیں بے پایاں محبت تھی۔ اُسے آنکھ سے اوجھل کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔۔۔ زیادہ تر وہ گھر ہی میں رہتا تھا۔ بہن کی جدائی کا غم اسے بھی تھا لیکن اس کے اور بیگم امتیاز کے غم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ فرمان اپنے دوستوں میں نئے نئے ساتھیوں میں دکھ کو بھولنے لگا۔ اُسے اپنا دل بہلانا آ گیا تھا! ۔۔۔ مگر بیگم امتیاز اپنی جوان مرگ بیٹی کو کبھی نہ بھول سکیں۔ جب فرمان کالج چلا جاتا اور امتیاز صاحب دفتر چلے جاتے۔ تب وہ شام تک بیٹھی رہتیں۔ اس کی کتابیں اور تصویریں سینے سے لگا کر

رہا کرتی تھیں۔ بہت سی چیزیں امتیاز صاحب نے ان کے سامنے سے ہٹا دی تھیں
اس کے تمام ملبوسات محتاجوں کو دے دیئے تھے۔ کتابیں نادار طلباء کو بخش دیا۔
اس کی تمام تصویریں چھپا دیں۔ مگر بیگم امتیاز نے اب بھی بہت کچھ چرا چھپا رکھا تھا ــــ
حتی الامکان وہ کبھی چاہتی تھیں کہ خود کو بہلا سکیں۔ مگر یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

صالحہ نے ان کے سارے دکھ بانٹ لئے۔ اس کی ذات ان کے زخموں کا مرہم
تھی۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ امتیاز صاحب کو اس نے کبھی انکل کہہ کر
مخاطب کیا تھا۔ انھوں نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"بیٹی۔ تم مجھے ڈیڈی ہی کہہ کے مخاطب کرو۔ معلوم نہیں میرے دل میں پیار
کی وہ جوالا ہی کیسے بھڑک اٹھتی ہے کہ جی چاہتا ہے۔ شادی مرگ ہو جاؤں! ـــ"

اگر بیگم امتیاز کو ان کی بیٹی مل گئی تو بیگم زیدی کی بھی ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی
تھی۔ انھیں فرحان کی ہستی میں ایک بیٹا ملا۔ وہ تو دن رات ان ہی سب کے ساتھ رہتا
تھا۔ اس قدر بے تکلف ہو گیا تھا جیسے کبھی کوئی غیریت اور بیگانگی ان میں تھی ہی نہیں۔
قریب قریب وہ سب ساتھ رہتے تھے۔ دن بے حد اچھے گزر رہے تھے۔ راتیں بہت حسین
ہوتیں۔ فرحان کو اچھے اچھے اشعار یاد تھے وہ سنایا کرتا۔ کبھی ندا سے کہانی سنتا اور
بے تحاشہ داد دیتا۔ اور اکثر عائشہ کے گانے ہوتے۔ انھیں موسیقی سے دلچسپی تھی۔

اگر کوئی محفل سے الگ تھے تو وہ شفقت تھے۔ فرحان انھیں بھی اپنے ساتھ
گھسیٹنا چاہتا تھا! ۔ ایک دو مرتبہ وہ آ بھی گئے مگر ان کی موجودگی میں سب بڑے
باضابطہ بن کر رہ گئے۔ جب سے نانا نے شاکر کو ان کے سلسلے میں ایک [illegible]
کر دی تھی۔ صالحہ ان سے جان بوجھ کر دور رہنے لگی تھی۔ جیسے ہی ان پر نظر پڑتی۔
اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ اور وہ تمام باتیں اس کے ذہن میں پھر گونجنے لگتیں جو اس کی
سہیلیوں نے کہی تھی۔۔۔۔۔

اگر کسی گھر والے نے اس کا سلوک اور ہی رنگ میں دیکھا تو کیا ہوگا۔ کس کس
کو وہ سمجھاتی پھرے گی اور کہنے والے سنتے کب ہیں؟

البتہ شفقت کو صالحہ کی بے رخی کا بہت شدید احساس تھا! ۔ مگر جہاں انھوں
نے اپنی دوسری تکلیفوں کا احساس نہیں کیا اور انھیں اظہار کے قابل نہیں سمجھا
ویسے ہی اس دکھ کو بھی نظرانداز کر دیا۔ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے
روز بروز صالحہ کی سرد مہری کا داغ گہرا ہوتا گیا۔ اور وہ آپ ہی اپنی نظروں میں گرتے
چلے گئے۔ وہ اُمنگ جو کسی کی محبت بھری نظر اور پُرخلوص پُرسش سے جوان ہوتی ہے
دن بدن مرجھاتی گئی اور انھوں نے اپنی ذات اور زندگی سے کبھی دلچسپی لینی چھوڑ دی۔
اب وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتے۔ گھر میں کون تھا جسے اُن کی غیر حاضری
کی پروا ہوتی۔ زیدی صاحب کو امتیاز صاحب کی ہم نشینی میں وہ لطف ملا کہ انھوں
نے گردوپیش پر نظر ڈالنی ہی چھوڑ دی۔ بیگم زیدی کو جوان مرد کا گھر ہی میں رہنا
پسند نہیں تھا۔ وہ تو دل ہی دل میں خوش ہوئیں کہ کسی طرح پاپ کٹا۔ صالحہ
ہی تھی جس نے اُن کی لاپروائی پہچان لی ۔۔۔ انسان زندگی کی فکر کرنا چھوڑ دے
تو وہ بہت نڈر ہو جاتا ہے۔ وہ اُن سے مل کر کہنا چاہتی تھی کہ برائی بدشگونی کے
پیچھے اپنی ناک نہ کٹائیں۔ ایک دن اس کا موقع بھی مل گیا۔ عائشہ اور فرحان نیلی
کوٹھی میں تھے۔ بیگم زیدی اپنے کسی عزیز سے ملنے گئی تھیں۔ صالحہ دالان میں بیٹھی
لکھ رہی تھی۔ اس کے ٹسٹ ہو رہے تھے!! ۔ اپنے پیچھے شہ نشین میں اس نے بھاری
قدموں کی آہٹیں سُنیں۔ مڑ کر دیکھا اور کچھ پریشان سی ہو گئی۔ شفقت اپنا بیڈ بند
بیگ لئے آہستہ آہستہ شہ نشین سے گزر رہے تھے۔ زینے کے موڑ پر انھوں نے صالحہ
کو دیکھا اور ایک پل کے لئے ٹھٹک گئے ۔۔

اتنے میں کلثوم نے صالحہ کی چائے میز پر لگا دی۔

"آپ سمجھے نہیں۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو غم کو گلے سے لگائے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جیسے مہم پسند لوگوں کو خطرات کی جستجو رہتی ہے اسی طرح جذباتی اور حساس لوگ غموں کی تلاش میں رہتے ہیں!—"

"ہاں یہ ٹھیک ہے اور اگر اُن کو اپنا کوئی غم نہیں ہوتا تو وہ دوسروں کے دکھ کو گلے سے لگا لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

"ایسے انسان تو فرشتہ ہوتے ہیں!—"

"فرشتہ؟—" وہ ہنس پڑے "فرشتوں کا رتبہ انسانوں سے بالاتر نہیں ہے—"

"آپ ایسے انسان کو بھی فرشتہ نہیں کہا جا سکتا؟—"

"مجھے؟—" وہ حیرت و تعجب کی تصویر بن گئے۔ "انسانیت اور فرشتہ پن تو بڑی دور کی باتیں ہیں عالیہ۔ میں تو اپنے آپ کو آدمی بھی نہیں سمجھتا!—"

"آپ آدمی بھی نہیں ہیں؟—" عالیہ نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں!— آدمی تو بہت سے محسوسات کا مجموعہ ہوتا ہے نا... وہ ہنستا ہے روتا بھی ہے اُسے کچھ اچھا لگتا ہے کچھ بُرا، اپنا بھی ہوتا ہے۔ کبھی اس کا مسرور دل ہوتا ہے۔ کبھی داغ۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں!— ایک سل ہے پتھر کی۔ جس پر چاہے آگ برسے چاہے پانی۔ سب برابر ہے!"

"آپ کی ایسی باتیں مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں!—"

"تم ایسی باتیں سننا ہی نہیں چاہتیں!—"

"بالکل نہیں!—"

"میری سمجھ میں نہیں آتا ہے عالیہ کہ مجھے تم سے کس قسم کی باتیں کرنی چاہئیں نہ دل بس میں ہے نہ زبان قابو میں۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی ایسی بات میرے

منہ سے نکل جائے کہ تمہیں صدمہ پہونچے۔

"اگر آپ کو سچ مچ میرا خیال اتنا ہی زیادہ ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ مجھے آپ کی یہ لاپرواہی بے نیازی اور بے حسی ذرا بھی پسند نہیں۔ خود کو آدمی سمجھئے اور آدمیوں ہی طرح زندگی گزاریئے۔"

"پھر کیا ہوگا؟" انھوں نے حد سے زیادہ معصومیت سے پوچھا۔

صالحہ کو ہنسی آگئی "پھر آپ کی ایک چاند سی دلہن آئے گی؟"

"اگر آدمیت کی معراج یہی ہے تو میں جانور ہی ٹھیک ہوں!" وہ بھی ہنسے مگر انھیں رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ صالحہ اتنی بے تکلف کیسے ہو سکی؟

انھوں نے اس کے چہرے کا غائر جائزہ لیا۔ صالحہ مسکرائی۔

"خیریت تو ہے۔ کیا دیکھ رہے ہیں آپ اس طرح؟"

"میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ خلوص جو آنکھوں میں مسکرا رہا ہے۔ بس جاننا ہی چاہتا ہوں کہ یہ جذبہ اتنے دن سے کہاں پوشیدہ تھا؟"

"یا اللہ! آپ تو شاعری کرنے لگے۔" صالحہ سنجیدہ ہوگئی۔ "کب آپ نے اندازہ لگایا تھا کہ مجھے آپ سے خلوص نہیں؟!"

"سچ ہے صالحہ۔ تم ہمیشہ سے مخلص ہو۔ میں نے ہی اندازہ لگانے میں غلطی کی تھی۔ اچھی بات ہے۔ آئندہ جو تم چاہتی ہو۔ وہی ہوگا۔ اپنا انعام جو تم نے ابھی دینے کا وعدہ کیا تھا..... دراصل تو میں آدمی بننے کی کوشش کروں گا"

"سنئے۔ میری ایک سہیلی ہے۔ نائلہ۔ اسے آپ بہت اچھے لگتے ہیں!!" صالحہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ خدا حافظ!" وہ جلدی سے اٹھے اور ہنستے ہوئے

چلے گئے۔ برآمدے میں فرمان سے مڈبھیڑ ہو گئی! —

"آہا — بھائی صاحب۔ ارے آپ تو نظر ہی نہیں آتے۔" اُس نے کہا۔ "آیئے واپس چلیں۔ ایک اہم معاملہ میں آپ کی رائے لینی ہے! —"

"میں تم لوگوں کے اہم معاملے سمجھتا ہوں۔ فلم چلو گے... کیوں؟ —"

"توبہ توبہ — میں تو فلموں کے نام بھی نہیں پڑھتا۔ مگر آپ قریب قریب سمجھ بھی گئے ہیں۔ اچھا آپ پروفیسر رازی کو تو جانتے ہیں نا؟ —"

"جانتا ہوں۔ تمہارے پروفیسر ہیں! —"

"جی ہاں۔ تو وہ اپنی سربراہی میں بہت سے لڑکے لڑکیوں کو ناگر جناساگر لے جا رہے ہیں۔ میں نے اپنا — اور باجی وغیرہ کا نام بھی لکھا دیا تھا۔ مگر —؟"

وہ چپ ہو گیا۔ شفقت مستفسرانہ انداز میں اُسے دیکھتے رہے۔ دو منٹ چپ رہ کر منہ لٹکا کر بولا "مگر ممی اپی اور عائشہ کو جانے کی اجازت نہیں دیتیں! —"

"کیوں بھئی —"

"کہتی ہیں کہ ایرے غیرے کے ساتھ نہیں جانے دوں گی۔ اگر کوئی اپنا چلے تو ٹھیک ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلے چلئے نا بھائی صاحب!! —"

"کب جا رہے ہو؟ —"

"... صبح ہی نکل چلیں گے! —"

"... ہے۔ فرمان۔ میرا لاسٹ ایئر ہے اور میرے پریکٹیکل چل رہے ہیں!"

"... تمہارے سب کی مرضی یہی ہے تو میں پریکٹیکل چھوڑ بھی سکتا ہوں!! —"

"نہیں جناب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے! —"

فرمان بد دل ہو کر واپس چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آئے۔ ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ صابرہ کی تمام گفتگو کے بعد دماغ میں گڈمڈ ہو رہی تھی جیسے ہزاروں ...

لاکھوں زبانیں اور کھُل جائیں مگر انھوں نے یہ اِس وزن وقار بدنامی کا کلنک وہی اونچی بیداغ پیشانی پر لگانا کیوں گوارہ کر لیا ہے۔ ان کا کیا مقصد ہے کیوں وہ ان کی پرورش کر رہے ہیں؟ ۔ اس سے حاصل بھی کیا۔ اگر وہ چاہیں تو آج ہی اس گھر کو خیرباد کہہ کر چل دیں۔ زیدی صاحب کو ان کے قیام سے کون سا فائدہ پہنچ رہا ہے جو جیسے جانے سے نقصان ہو گا؟۔

وہ خیالوں کی دنیا میں گھومتے رہے۔ اُمید وبیم، آس و نراس۔ بہت سے احساسات تھے جن کا تجزیہ کرنا مشکل تھا! ۔۔ دیر تک وہ بستر پر پڑے سوچتے رہے!۔

اندر کہیں کھانے کا گانگ بجا اور ملازم انھیں بلانے آیا۔

"کمرے میں کون کون ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"سب ہیں صاحب!" ملازم نے کہا

اُنھوں نے جلدی جلدی لباس بدلا اور بہت دنوں بعد طعام خانے میں پہنچے!

"آج کل کوئی خاص مصروفیت ہے تمہاری شفقت؟" زیدی صاحب نے پوچھا!

"جی نہیں تو!" انھوں نے کہا۔ اور فرمان کی طرف دیکھ کر کہا....

"پریکٹیکل کب سے شروع ہو رہے ہیں؟"

زیدی صاحب سے کچھ چھپانا ممکن نہیں تھا انھوں نے بتا دیا۔

"بس تو یہ واہیات ہے کہ اہم صرفیات چھوڑ کر جنگلوں پہاڑوں کی خاک چھانی جائے" انھوں نے کہا۔ اور اپنی پلیٹ سیدھی کر کے شوربہ نکالنے لگے!۔۔

"خاک کیسی بابا جان؟" فرمان نے کہا "ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی۔ اب تو ہر طرف دلدل ہی دلدل ہو گی!"

بیگم امتیاز کو فرمان نے خود ہی ہمدرد کر لی تھی۔ انھوں نے اس کے پروگرام میں

داغِ دل

شرط لگا دی تھی کہ کوئی اپنا ساتھ جائے۔ شفقت کو معروف دیکھ کر رازی کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔۔!

"میں انہیں جانتا ہوں۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔" شفقت نے کہا۔

"اب ایک اہم مسئلہ رہ جاتا ہے!" زمان نے صائمہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اپی کبھی دیں کی نشست کے اختتام پر ناول کا آغاز کریں گی۔ اگر وہ نہیں چلیں گی تو ہم سب کا جانا بیکار ہے!"

زیدی صاحب نے بڑی محبت سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور پیار سے بولے:

"ہاں۔ جائیں گی کیوں نہیں۔ اب تک مسلسل پڑھنے لکھنے سے دماغ پر جو بار پڑا ہے۔ وہ بھی ہلکا ہو جائے گا۔۔!"

"کیوں اپی؟" زمان نے پوچھا۔

"اچھی بات!" صائمہ نے بے دلی سے کہا اور اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

زمان بڑے جوش و خروش سے پروگرام بنانے لگا۔ صفدر رحیم اس نے امتیاز صاحب سے بھی بات کی اور چاہتا تھا کہ دو چار دن بڑے مزے میں گزارے جائیں۔

کھانے کے بعد وہ اپنے گھر چلا گیا۔ اور سب لوگ بھی ادھر ادھر ہو گئے۔

بیگم زیدی کو یہ تفریحیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ وہ پرانے خیالات کی ایک سیدھی سادی عورت تھیں۔ تعلیم بھی واجبی سی تھی۔ ان کی شادی کم سنی ہی میں ہو گئی تھی۔ زیدی صاحب لکچرار ہو چکے تھے۔ بیوی کے گھریلو معاملات کا ایسا شعور بھی نہیں۔ بیٹی سسرال میں دیکھا کر اٹھنا بیٹھنا ہی پڑھنا لکھنا تھا!۔ میاں کو بیوی سے بات کرنے کی فرصت نہیں۔ کتاب پر سر اوندھائے بیٹھے ہیں!۔ وہ تو بس اتنا ہی جانتی تھیں کہ عورت کو امورِ خانہ داری میں ماہر ہونا چاہئے۔ وہ بہترین ہونے کا اور [illegible] تھیں۔ مگر انھوں نے جنت کا نمونہ بنا رکھا تھا کہ دل میں خیال

کیجئے اور مطلوبہ چیز حاصل۔ وہ بے چاری یہی چاہتی تھیں کہ ان کی لڑکیاں بھی انہی کی سی ہوں۔ کون سا پڑھ لکھ کے انھیں وزیر اعظم بننا تھا!۔

زمانہ برسوں آگے بڑھ آیا تھا۔ پرانی قدریں فرسودہ کینچلی اتار کر نئے علمی معاشی اور ثقافتی ملبوسات پہن رہی تھیں۔ رسم و رواج میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں لیکن بیگم زیدی کو اپنی پچھلی ڈگر ہی پسند تھی۔ نیا زمانہ نئے فیشن اور نئی باتیں انہیں نہایت گراں گزرتیں۔

اور اب زیدی صاحب کے خبط نے انھیں دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ تو نہ جانے کیا سوچ بیٹھے تھے۔ صالحہ اُن کی نظروں میں بچی تھی۔ جیسے کوئی سمجھ نہیں تھی۔ اس کا اچھا بُرا ایک ایک سب وہی سوچتے تھے۔ بیگم زیدی دل ہی دل میں ہولیں کھاتیں۔ اُن کی نظریں تو دیکھ رہی تھیں کہ صالحہ بیس سے اوپر تھی اس عمر میں ان کی شادی ہو چکی تھی اور صالحہ اپنے سن و سال سے بے خبر ہے اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر وہ امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے بھی آئے گی۔ تو اس سے اسے کیا فائدہ پہنچے گا؟۔ اس کی اعلیٰ تعلیم ان کے نزدیک نقصان رساں تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ کو معیاری شوہر کہیں نہیں ملتا۔ ساری زندگی آہوں اور سسکیوں میں گزر جاتی ہے!۔

وہ جس قدر سوچتی گئیں انھیں اپنے جاہل اور پس ماندہ بھائی بھاوج حق بر اور اپنے خیر خواہ معلوم ہوئے۔ زیدی صاحب اولاد کے دشمن نظر آئے۔

انھوں نے سوچا کہ اگر وہ اس کے باپ ہیں تو میں بھی ماں ہوں۔ جتنا حق اولاد پر انھیں ہے۔ مجھے بھی ہے۔ غصے اور طیش میں انھیں کچھ سجھائی نہیں دیا۔ اب تو وہی ہوگا جو وہ چاہیں گی۔

انھوں نے شوہر سے چھپا کر اپنے بھائی کو لکھ دیا کہ وہ فردوس کے بھائی کا رشتہ

لے کر آ جائیں۔ دل کا بخار اغبار وہ کاغذوں پہ نکال کر مطمئن ہو گئیں اور صبح سویرے ہی ملازمہ سے خط پوسٹ کروا دیا۔

فرحان پوری طرح تفریح کے موڈ میں تھا۔ اپنے گروپ کا سربراہ وہی تھا۔
دو تین دن تک اس کی کمپنی سے سب لڑکوں نے خوب مزے کئے۔ پورا اک بنگلہ
کرائے پر لے رکھا تھا۔ باورچی اور دوسرے ملازم ساتھ تھے۔ جہاں جاتے وہیں کھاتے
پکاتے اور پھر گھومنے نکل جاتے۔
پروفیسر باذمی نگران کار کی حیثیت سے ساتھ تھا۔ وہ گندمی رنگ اور شاندار
جسم کا ایک قابل توجہ نوجوان تھا! —
ایک سرسبز ٹیلے پر بیٹھا وہ سگریٹ کے ہوئے ہوئے کش لے رہا تھا۔ اس کی
نیم باز آنکھیں صالحہ پر لگی ہوئی تھیں۔ جو گہرے فالسئی رنگ کے لباس میں لپٹی بڑی
سادہ اور پرکشش لگ رہی تھی۔
دفعتہً اس نے فرحان کو آواز دی۔ وہ بیٹھا کارڈز پھینٹ رہا تھا! ۔ لپک کر پاس
آیا۔ اور ادب سے بولا۔
"یس سر! —"
"بھئی — میں کل پرسوں سے اُس لڑکی کو دیکھ رہا ہوں —" اس نے انجان
بن کر پوچھا۔
"یہ ہمارے ساتھ ہے یا کسی اور گروپ کی ہے؟ —"
"سر یہ تو شروع سے ہی ہمارے ساتھ ہیں! —" فرحان نے کہا "میری بڑی
بہن — مس صالحہ زیدی —!"
"کیا مطلب؟ — صالحہ زیدی —" وہ چونک پڑا — "ان کی کہانیاں وغیرہ

بھی تو شائع ہوتی ہیں! ــ

"جی ہاں! ــ"

شکریہ۔ بھئی۔ یہی پوچھنا چاہتا تھا! ــ" اس نے مسکرا کر کہا۔ فرمان لوٹ کر آیا تو چپراسی نے کہا کہ وہ سب بنگلے پر چلے گئے ہیں! ــ

دوپہر کو آسمان پر گہرے مٹیالے بادل محیط ہو گئے اور موسم سرد ہو گیا تھا۔ تمام لڑکے لڑکیاں گرم لباس میں اپنے مختلف تفریحوں میں گم تھے! ــ ندا دریچے کے سامنے بیٹھی دور افق پر آسمان و سمندر کو گلے ملتے دیکھ رہی تھی! ــ

آتشدان کے پاس عائشہ تھی! ــ اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگ کی سمت بڑھا رکھے تھے۔ ننھے ننھے سرخ شعلے اس کے رخساروں پر لو دے رہے تھے۔ اپنے اونی کوٹ اور مفلر میں وہ اس طرح گم تھی کہ صرف چہرہ اور ہاتھ باہر نظر آ رہے تھے۔ فرمان اس کے سامنے آ بیٹھا۔ وہ گھٹنوں تک لمبا کوٹ پہنے تھا! ــ کانوں تک ٹوپی منڈھی تھی۔ عائشہ اسے دیکھ کر ہنس دی۔

"تم مجھے اس قدر جھینپو اور ڈرپوک سمجھتے ہو! ــ"

ہر لڑکی کو سمجھتا ہوں۔" اس نے کہا اور رک کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "آپ کو معلوم نہیں۔ کیتھی جان کی لڑکی ہے ایک ماریہ۔ وہ چہرے کے بل ہی پیدا ہوئی ہے۔ انتہائی ڈرپوک ہے۔ کوئی ذرا زور سے بولے، ڈانٹ دے، گھنٹوں روتی رہے گی ــ!"

"مجھے ایسی لڑکیاں بے حد اچھی لگتی ہیں۔" عائشہ بولی۔ "اتنا نازک سا دل رکھتی ہیں۔ جیسے آبگینہ ہو۔ ٹھیس لگی اور کرچی کرچی ہو گیا۔"

"مجھے تو اس کی شکل ہی دیکھ کر غصہ آتا ہے۔" فرمان نے کہا اور اپنے ہاتھ دہکتے ہوئے کوئلوں سے سینکنے لگا۔ عائشہ آتشدان میں چٹختے ہوئے سرخ انگاروں

شعلوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کھنچے ہوئے لبوں پہ مبہم سی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی
گھنی گھنی پلکوں کا عکس رخساروں پر لرزاں تھا۔ دفعتہً فرمان نے اپنے گرم گرم ہاتھوں
میں عائشہ کا چہرہ تھام لیا۔ وہ چونک کر سہمی سہمی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ فرمان
کو ہنسی آگئی۔

"دیکھئے میں کہہ رہا تھا کہ میں ہر لڑکی کو ڈرپوک سمجھتا ہوں۔ آپ کیا سمجھیں۔ میں
جلا دوں گا آپ کا چہرہ ــــ!"

"تم نے مجھے ڈرا دیا ــ فمی! ــ" وہ جھینپ کر ہنسنے لگی۔ فرمان نے اپنے
گال تھام لئے اور بڑی رومان انگیز ادا سے بولا۔

"معلوم نہیں کیوں۔ جب آپ مجھے فمی کہتی ہیں تو کیوں میرا دل سمندر بن جاتا ہے
اور اس میں عجیب عجیب سی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں اور جب کوئی اور مجھے فمی کہتا ہے
تو میں بالکل پتھر ہو جاتا ہوں۔ آپ نے بھی محسوس کیا کہ نہیں؟ ــ" اُس نے ہنستے
ہوئے عائشہ کو دیکھا۔ اور پہلی مرتبہ عائشہ کو اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں ایک
سنجیدہ و زندہ باقی مرد کے [illegible] جذبات خوابیدہ نظر آئے۔ اس نے اپنی پلکیں
جھکا لیں۔ اور چپکے سے بولی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ بابی کی [illegible] نے تمہیں بھی شاعر واعر بنا دیا ہے۔ مجھے تو
کچھ بھی نہیں محسوس ہوتا! ــ"

"آپ نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ہو گی۔"

"ایسی باتیں تو خود بخود ایک ہونے کی طرح سر میں سماتی ہیں۔ سمجھا بوجھا کون ہے!"

"پتہ نہیں۔ میں کبھی نہیں [illegible] بس نحوہ سے [illegible] دیتا ہوں۔ اب آپ کی مرضی۔
سچ جانئے کہ نہ جانئے ــــ!"

ملازم چائے لے آیا۔ اور بہت سے لوگ ہال میں آ گئے۔ دراز کی کھلی تھا۔

فرمان اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک لڑکے کے پاس جا بیٹھا۔

"کیسا کہر آلود موسم ہے ۔۔۔" ایک لڑکی نے دریچے سے آسمان کو دیکھتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ "ابھی پانی برسنے لگے گا ۔ اور ہم سب بند کمرے میں گھٹ کر رہ جائیں گے!"

"بھئی بہت گھوم پھر چکے ۔ اب کچھ شعر و شاعری ساز و سنگیت ہو ۔" دوسری نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے!" رازی نے اپنی موٹی آواز میں تائید کی۔

پھر سب آمادہ ہو گئے۔

"جناب پہلے آپ!" فرمان نے رازی سے کہا۔

"صرف ایک قطعہ یاد ہے!" رازی نے بے بسی سے کہا

"ویری نائیس سر!" فرمان نے جلدی سے حوصلہ افزائی کی۔

اس نے ایک ہلکی سی نظر صاعقہ پر ڈالی ۔ جو ان سب سے دور بیٹھی ۔ مگر گویا برآواز تھی ۔ رازی سمجھتا تھا کہ یہاں اس کا سا سنجیدہ سخن فہم اور کوئی نہیں ہے۔ اسے جھجک سی محسوس ہوئی مگر دوسرے لمحے اس نے سوچا کہ اگر وہی شرمائے گا تو اس کے طالب علموں کا کیا حشر ہوگا؟" بڑی لے سے بولا۔

"اچھا بھئی۔ شعر وزن سے ہٹ جائے تو کچھ کہنا مت ۔ کیونکہ میں انگلش کا پروفیسر ہوں ۔ اردو کا نہیں ۔۔

بڑے دلچسپ وعدے تھے، بڑے رنگین دھوکے تھے
گلوں کی آرزو میں زندگی شعلے اٹھا لائی
بتاؤ تو اندھیروں کی فصیلوں سے پرے آخر
کہاں سے قافلہ گزرا کہاں تک روشنی آئی (جامی)

سب نے اُن کا مقام اپنے سے بلند سمجھ کر خوب دل کھول کر داد دی۔

"اب آپ سنائیے" — اچانک رازی نے صالحہ سے کہا۔ "ویسے پہلے آپ ہی کو تکلیف دینا چاہیے تھی۔ کیونکہ آپ کی سی سخن فہم یہاں کوئی دوسری شخصیت نہیں ہے!"

"شکریہ" — صالحہ نے بے رخی سے کہا۔ "مجھے کچھ یاد ہوتا تو میں ضرور سناتی"

"ایک حسین سا شعر بھی یاد نہیں؟" — فرمان نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"افسوس کہ نہیں!" — صالحہ نے کہا۔ اور ان کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔

"باجی افسانے لکھتی ہیں جناب۔ شعر شاعری سے انہیں زیادہ دلچسپی نہیں ہے!"

عائشہ کو صالحہ کی بدمزاجی پر بڑی حیرت ہوئی۔

"تو پھر آپ ہی سنائیے؟" محفل بے رنگ ہونے لگی

"جب باجی کو کوئی شعر یاد نہیں تو بھلا مجھے کیا یاد ہے؟" — عائشہ بولی۔

"کم از کم آپ کوئی چھوٹا سا افسانہ ہی سنا دیجئے!" — رازی کے کالج کا ایک لڑکا صالحہ سے بولا۔ اور سب پھر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ حالانکہ اس کا دل نہیں چاہتا تھا مگر اُن کے اصرار پر اُسے اپنے ناول کا ایک ادھورا باب سنانا ہی پڑا۔ پھر عائشہ نے ایک غزل سنائی۔ فرمان نے بیٹلز طرز پر ایک مغربی سونیٹ گایا۔ دیگر لڑکوں نے بھی حصہ لیا۔ اور اس طرح وقت گزر گیا۔ کہر آلود شام ماحول پر چھا گئی — جلد ہی کھانا کھا کر وہ سب اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے۔

صالحہ اپنے ساتھ نامکمل افسانہ لیتی آئی تھی۔ دوسری لڑکیاں بستروں لیٹی دنیا بھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ کسی نے فلمی کہانی چھیڑی تھی اور ساتھیوں کو مع ایکٹنگ کے گیت گا گا کر کہانی سنا رہی تھی۔ کوئی اپنے محبوب کی بے پایاں شہرت کے قصے کہہ رہی تھی۔ اور اپنی سہیلی کے للچانے کا تماشہ دیکھ کر لطف اُٹھا رہی تھی۔ حالانکہ محبوب کے قصے نری گپ ہی تھے۔

خالدہ ان سب سے الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ دریچے کے باہر اس کی آنکھیں آس پاس دور بعید افق پر جمی تھیں۔ جہاں چاندنی برف کو روپہلی ردا اوڑھا رہی تھی۔ ہوائیں نغمہ ریز تھیں۔ اور بھیگا بھیگا موسم آنے کسی اور ہی جہان کی یاد دلا رہا تھا!۔

اس نے اپنے کاغذات پر کہنی ٹیک دی اور خیالوں کے ہلکے پھلکے تخت پر بیٹھی ماضی دنیا کی سیر میں کھو گئی۔

وہ عجیب و غریب دنیا۔ جہاں اس کے ساتھ اس کا محبوب فنکار تھا اور بس۔ ویسے بے شمار ادھر ادھر سے ہیولے متحرک تھے۔ جن کے چہرے دھندلے تھے۔ خد و خال غیر واضح۔ جو اجنبی تھے اور بالکل بے تعلق۔

پھر اس کی نیم باز آنکھوں کے آگے ایک بڑا سا شاندار ہال جگمگانے لگا۔ جس میں بہت سی کرسیاں بچھی تھیں۔ ان گنت قمقمے روشن تھے اور اجنبی اجنبی خوشبوئیں تھیں۔ چھت میں رنگ برنگے غبارے ہولے ہولے تیر رہے تھے۔

ایک بہت بڑے مشہور ادیب گمنام کے اعزاز میں جلسہ ہو رہا تھا۔ لاکھوں آنکھیں اس کے دیدار کی مشتاق تھیں۔ بے شمار لوگ اپنے محبوب فنکار کو دیکھنے کے لئے جذبۂ محبت کا طوفان اپنے سینے میں چھپائے اس کے منتظر تھے۔ اور اشتیاق و اضطراب کا شعلہ اس کے دل میں بھی فروزاں تھا۔ ایک دوسرے کی تحریروں نے انہیں آپس میں متعارف کر دیا تھا وہ سب سے الگ تھلگ کھڑی تھی۔ اور گمنام کی دید کی تپش میں سارا جسم ایک آنکھ بن گیا تھا۔

اس کے جسم پر سنہرے زرکار پھولوں والی آسمانی ساڑی تھی۔ سیاہ بلاوز، وہ سب سے منفرد شخصیت رکھتی تھی۔

پھر شاید تب ہی ایک شور سا برپا ہو گیا۔

[illegible] وہ اس کے تخیل سے کہیں مختلف تھا۔ بے حد معصوم اور

شاندار، شرمیلے انداز میں مسکراتا ہوا۔ جیسے یہ عظیم الشان استقبالیہ جلسہ اُسے مغرور و متکبر کرنے کے بجائے اس کی خجالت و ندامت کا باعث بن گیا تھا۔

پھر صالحہ کی چشم تصور نے دیکھا کہ ایک معزز پروفیسر اس کے پاس آ کر رکا اور سر جھکا کر بڑے ادب سے کہا۔

"مس زیدی تشریف لے چلئے۔ شاہ آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں!"

اللہ اللہ..... اس نے دفعہ جذبات سے پلکیں بند کر لیں۔ رتی برابر بھی حقیقت اس خواب میں ہے کہ نہیں۔ یا وہ سرے بے سرو پا خوابوں کی طرح یہ بھی اپنی تعبیر کے لئے سسکتا رہ جائے گا۔؟

رات بھیگنے لگی تھی۔ اور اَن دیکھی برف گر رہی تھی! ۔ ہر چیز بھیگی بھیگی اور ٹھٹھری ہوئی تھی۔ صالحہ نے خواب کی دلکش وادی سے حقیقت کی سنگلاخ دنیا میں واپس آتے ہوئے بڑی حسرت سے سوچا کہ ۔ اس کے ذہنی مرتبہ و مقام نے اُسے دوسروں سے بڑی دور کر دیا تھا۔ کیونکہ کمرے کی تقریباً ساری لڑکیاں اپنے گرم لحافوں میں لپٹی سو رہی تھیں! ۔۔ وہی اکیلی تھی۔ جو مدت سے دریچے میں ایک اسٹیچو کی طرح بیٹھی ہوائی قلعوں کی سیر کر رہی تھی اور جسے کسی نے چھیڑنے کی ہمت بھی نہیں کی تھی۔ اور اس کے آرام و آسائش کے متعلق کچھ پوچھے بغیر سو گئی تھیں۔ حتیٰ کہ عائشہ بھی بے خبر سو رہی تھی!

اس نے ٹرانسسٹر کو بھی آف کر دیا۔ اور دریچے کے شٹر کھول دیئے یکبارگی برفانی ہوائیں اندر گھس آئیں اس نے اپنے سرد بستر پر لیٹ کر گردن تک کمبل کھینچ لیا۔

صبح کو وہ ملازمہ کے جگانے پر ہی بیدار ہوئی۔ دن کے نو بج رہے تھے۔ ایک سنہری اور رنگیلی صبح صحن میں مسکرا رہی تھی! ۔۔ اس کے ساتھی صحن ہی میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"باجی۔ کیا ساری رات آپ اپنا ناول مکمل کرتی رہی تھیں۔ اب جاگی ہیں؟"

فرمان نے کہا۔ اور ملازم کو تازہ کافی بنانے کا آرڈر دیا۔ وہ دانتوں پر برش
کرکے اس کے پاس آبیٹھی۔

اسی دن واپسی تھی۔ اسباب گاڑیوں پر بار کرایا گیا تھا! — دوسرے لوگ
اپنا اپنا سامان سمیٹ کر کاروں میں بیٹھ گئے۔ پروفیسر رازی کی جیپ میں اتفاق سے وہی
چاروں تھے جنہیں وہ بچانا چاہتا تھا۔ صالحہ، عائشہ، فرمان اور اس کی ملازمہ۔ سب
گاڑیاں اوپر نیچے زگ زیگ راستوں پر سے بڑی احتیاط سے روانہ ہوئیں۔ اور پھر
سلوپ پر فراٹے بھرنے لگیں۔

گاڑی پروفیسر چلا رہا تھا! — فرمان دوربین آنکھوں سے لگائے دور خلاؤں
میں دیکھ رہا تھا! — دفعتہً وہ بول پڑا۔

سر! کیا یہ سچ ہے کہ جہاں اُفق زمین سے ملتا ہے۔ وہیں سے فرشتے زمین پر
اُترا کرتے ہیں!؟" —

پتہ نہیں! — رازی ہنس کر بولا۔

پھر یہ فرشتے آسمان سے نیچے کیسے آتے ہیں؟ — عائشہ نے چلبلے پن سے پوچھا

جیسے آپ آئی ہیں! — رازی نے کہا۔ فرمان ہنس پڑا۔

"کیا لڑکیوں کو بھی فرشتہ کہیں گے! — ارے کالڈ حوریں — کیوں جناب؟"

یکایک ایک نشیب میں جیپ کا پہیہ پھنس کر اچھلا اور جیسے ہی گاڑی راستے
پر آئی — اسے ایک جھٹکا سا لگا اور صالحہ جو دروازے میں بیٹھی تھی۔ یکبارگی سیٹ سے
لڑھک کر سڑک پر آگری۔ ایک ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکلی۔ اور فوراً ہی اس
پر غشی طاری ہوگئی۔ معلوم نہیں کنپٹی میں کس جگہ چوٹ لگی تھی کہ اس کی نکسیر بہہ نکلی!۔

رازی نے گاڑی روکی اور جھپٹ کر نیچے اترا۔ فرمان اور عائشہ بھی بدحواس باختہ
ہوکر کود پڑے۔ رازی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اگلی گاڑیاں نظروں سے اوجھل ہوچکی تھیں

سڑک سنسان تھی۔ ایمرجنسی ایڈ کا کیمپ بہت پیچھے رہ گیا تھا! — شہر دور تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ملازمہ بدحواسی میں چیخ رہی تھی۔ فرمان نے اس کا بازو جکڑ رکھا تھا: — عائشہ اپنی باجی کو آوازیں دے رہی تھی۔ سب بوکھلا گئے تھے۔

پھر رازی ہی کو ہوش آیا۔ اس نے جھک کر عالیہ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور جیپ کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔

"جلدی کرو" اس نے ہانپتے ہوئے کہا "یہ بیہوش ہیں۔ فوراً طبی امداد ملنی چاہیئے" اور سب کو گاڑی میں بھر کر اندھا دھند جیپ شہر کی طرف دوڑا دی۔

عالیہ کا سر فرمان کی آغوش میں تھا۔ اور پاؤں عائشہ کی گود میں۔ وہ غافل تھی اس کا لباس خون سے تر بتر تھا اور خون اب جمنے لگا تھا! نکسیر بند تھی! — عائشہ بہت زیادہ بدحواس تھی۔ اس نے اپنی بہن کا خون کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ باہر دیکھ رہی تھی کس طرح مکانات الیکٹرک پول، آدمی، سواریاں اور سڑک بگولوں کی طرح پیچھے بھاگی جارہی تھیں۔

جلد ہی اسپتال آگیا۔ اور اسٹریچر پر عالیہ کو لٹا کر ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا اُسے کچھ کچھ ہوش آچلا تھا۔ ڈاکٹر کی کوششیں بھی بار آور ہوئیں اور اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ سب سے پہلے اس کی نظر رازی پر پڑی جو اس کے پائینتی کھڑا بڑی امید افزا نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ آس پاس فرمان و عائشہ تھے! — لمحہ بھر کے اندر اندر اس کا بکھرا ہوا دماغ سکون پذیر ہو گیا اور سارا معاملہ یکبارگی سمجھ میں آگیا — !

فرمان نے اس پر جھک کر والہانہ انداز میں کہا "خدا کا شکر ہے آپ کو ہوش آگیا۔ اب کہاں تکلیف ہے؟"

آپ کی کیا رائے ہے۔!؟" رازی دفعتہً صالحہ کی طرف مڑا۔
ای۔ بہت جلدی گھبرا جاتی ہیں۔ انہیں معلوم نہ ہونا چاہئے"۔ صالحہ بولی۔
رازی کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر وارڈ سے نکل کر چلا گیا۔
صالحہ کو نرس ایک اور انجکشن لگا کر چلی گئی۔ اس پر آہستہ آہستہ گہری نیند طاری ہونے لگی۔ دو ہی منٹ بعد وہ بے خبر سو گئی۔
عائشہ اور فرمان نے ایک دوسرے کو خوفزدہ انداز میں دیکھا۔ فرمان نے اپنے کان پکڑ لئے۔
"قسم کھاتا ہوں۔ پھر کبھی ایسی حماقت نہیں کروں گا۔ یا خدا یہ سوچ کر دل پانی پانی ہو رہا ہے کہ اگر ممی اور ڈیڈی کو پتہ چل گیا تو میرا کیا حشر ہوگا۔"
"ان سے کہے گا کون؟!" عائشہ نے دردمندی سے بولی۔ اسے فرمان کی حالت پر ترس آ رہا تھا!۔ "باجی بھی نہ کہیں گی۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو اسی لئے کہتے ہیں کہ بزرگوں کی ہر بات بے چون و چرا مان لینی چاہئے۔"
وہ بولا اور تھکن کی گہری سانس لے اسٹول پر ٹک گیا۔
عائشہ چپکے سے صالحہ کے پائنتی بیٹھ گئی۔ دونوں گہری سوچ میں گم تھے۔
اندر باہر ہر جگہ سناٹا تھا!۔ سردی کم تھی۔ دریچے کے باہر لمبے لمبے درخت بالکن کھڑے تھے۔ ہوا بند تھی۔ اور سناٹا انہیں غیر فطری لگ رہا تھا۔

بیگم زیدی اپنے بھائی کو خط لکھ کر بھول گئی تھیں۔ غصے اور جلد بازی کا کام تھا۔ اس کا نتیجہ معلوم۔ تیسرے ہفتے ہی دن نوازش حسین صاحب نے جواب دیا کہ وہ اور اُن کا سارا خاندان کچھ عرصے کے لئے اُن کا مہمان بننے کے لئے آ رہا ہے۔ اور یہ کہ اُن کی بھابی نے حالہ کا بے حد زوردار رشتہ دیکھ رکھا ہے۔ وہی آکر تفصیل سنائیں گی! ——

خط پڑھ کر شمسہ بیگم کے چھکے چھوٹ گئے۔ ایسی کوئی بات نہیں کہ وہ ہفتے دو ہفتے کی مہمان داری نہ کر سکتیں —— وہ تو اس خیال سے لرز رہی تھیں کہ زیدی صاحب سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ بلکہ اُن سے انتقام لینے کی خاطر یہ سارا فساد کھڑا کر دیا تھا اگر واقعی کوئی زوردار پیغام بھابی جان لے آئیں اور زیدی صاحب سے کہہ دیا کہ وہ زیدی بیوی کی ایما پر پیغام لائی ہوں تو پھر وہ کیا نہیں کہیں گے؟ ——

حالہ کی شادی کے تذکرے سے زیدی صاحب کو بخار آتا تھا۔ وہ تذکرہ ہی کرنا یا سننا نہیں چاہتے تھے: ——

ایک دم گھر بھر میں سناٹا پھیلا پڑا تھا۔ جی یوں ہی گھبرا رہا تھا کہ خط نے ان کا بلڈ پریشر بڑھا دیا۔ بڑی متفکر اور سراسیمہ ہو گئیں۔ خط کو گریبان میں چھپا لیا اور زیدی صاحب کے پاس ان کی لائبریری میں پہنچ کر بولیں ——

"آپ تھوڑی دیر کے لئے باہر آکر بیٹھئے۔ میں ذرا نمرہ بہن سے ملنے جا رہی ہوں"

ذرا کیا —— تم بہت ظالم ہو ——!" زیدی صاحب نے سگار منہ میں رکھ کر

موٹی آواز میں جواب دیا "گھر میں باہر نہیں بیٹھ سکتا! ــ دماغ بٹ جاتا ہے۔ اتنے بڑے دالان میں بیٹھ کر پڑھنے سے!" اور پھر صوفہ کی پشت گاہ سے ٹک کر کتاب چہرے پر آڑ کر لی ۔ بیگم کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر خاموشی سے پلٹ آئیں اور باغ کی راہ نیلی کوٹھی چل دیں ۔

ادھر وہ گئیں اور ادھر رازی کی جیپ گیٹ میں داخل ہوئی ۔ اس نے گاڑی وہاں روک دی ۔ اور اشارے سے چپراسی کو اپنی طرف بلایا ۔ وہ دوڑا آیا

شفقت صاحب گھر پر ہیں ؟!

"جی ہاں ! ــ"

کیا کر رہے ہیں ۔

جی معلوم نہیں ۔ دیکھ کے بولتا ہوں ــ!" وہ مڑا ۔

سنو ــ :" رازی نے مدھم آواز میں کہا ۔ ان سے جا کر کہو کہ آپ کو رازی صاحب باہر بلا رہے ہیں ۔ جس طرح بیٹھے ہوں ویسے ہی چلے آئیے ! ــ"

چپراسی تیر کی طرح اندر گیا اور ایک ہی منٹ بعد شفقت نظر آئے ۔ رازی نے ہاتھ ہلا کر انھیں جلد تر آنے کی ہدایت کی وہ متحیرانہ انداز میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے قریب پہونچے ۔

ہیلو ۔ شفقت ! ــ" رازی نے قدرے مسکرا کر کہا " کیا بہت مصروف رہتے ہو ۔ ملتے ہی نہیں ! ــ"

" کیا بات ہے ۔ تم بہت گھبرائے ہوئے نظر آ رہے ہو ۔ بچے کہاں ہیں کیا وہ سب واپس آ گئے " شفقت نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا :

گھر تو کوئی نہیں پہونچا ــ!"

رازی نے بڑے مختصر الفاظ میں سارا قصہ کہہ سنایا شفقت کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"ابھی تک بیہوش پڑی صائمہ؟ ——"

نہیں نہیں۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو ——! رازی بے صبری سے ہاتھ ہلا کر کہا "وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بیہوشی بھی طاری نہیں ہے لیکن چونکہ اس کا امکان ہے لہذا ایک رات وہ اور ٹریٹمنٹ کے لئے ہسپتال ہی میں رہیں گی! ——"

لیکن گھر پہ کیا کہا جائے گا ——؟ شفقت نے سوالیہ نظروں سے رازی کو تکتے ہوئے پوچھا۔

وہی تو میں تم سے کہنے آیا ہوں۔ پروفیسر صاحب کے پوچھے بغیر تم اپنی طرف سے کہہ دو کہ ساگر سے رازی نے فون پر اطلاع دی ہے۔ وہ سب کل سہ پہر تک آ پائیں گے! ——"

اور دوسرے لوگ —— فرمان اور عائشہ؟؟! ——

"دوسروں کو اس حادثے کی خبر بھی نہیں ہے وہ تو سب اپنے گھروں کو پہنچ گئے۔ فرمان اور عائشہ وہیں ہیں۔ مس زیدی کے پاس۔ وہ اپنے والدین کے خوف سے یہاں آنے پر تیار نہیں۔ کل صائمہ کے ساتھ اس طرح آئیں گے جیسے ابھی ابھی آ رہے ہوں! ——"

"مگر میں دیکھنا چاہتا ہوں صائمہ کو —— اندازہ تو لگا سکوں وہ اب کیسی ہیں؟"

"ہاں ہاں —— تو چلو میرے ساتھ! ——"

شفقت نے زیدی صاحب کو جھوٹی اطلاع پہنچا دی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ۔ انہوں نے شفقت کو بلا بھیجا۔

"بھئی یہ لوگ بہت پریشان کرنے لگے ہیں.... کب آئیں گے۔ کس نے فون کیا تھا؟"

"فون۔ جی وہ..... جی ہاں رازی صاحب کا تھا۔ کل سہ پہر تک سب آجائیں گے!—" شفقت نے دل کڑا کر کے کہا۔

"اور اب تم کہیں جا رہے ہو؟—"

"جی ہاں دوست بلانے آیا ہے۔ گھنٹہ بھر میں واپس آجاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔!" وہ پھر کتاب میں ڈوب گئے۔ شفقت باہر نکلے۔ اور رازی کے ساتھ چلے گئے۔

وارڈ کی دہلیز پر فرقان کی بڑھی ملازمہ بیٹھی تھی۔ اس کے انداز سے لاپرواہی برس رہی تھی۔ ایک مرتبہ اپنی اونگھتی آنکھوں سے انھیں دیکھا اور پھر اونگھنے لگی!

دونوں کو دیکھ کر فرقان اور عائشہ یکبارگی مشینی انداز میں اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور تشکر آمیز نظروں سے شفقت کو دیکھنے لگے۔

"سب خیریت تو ہے؟" رازی نے پوچھا۔

"جی ہاں ——" فرقان نے ہانپتی ہوئی سانسوں کو قابو میں کر کے جواب دیا۔

شفقت نے صالحہ کو دیکھا۔ جو سینے تک چادر تانے کا کمبل اوڑھے سکون سے سو رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر اوڈی کولون میں بھیگی ہوئی تر پٹی بندھی تھی۔ ناک کے بانسے پر بھی دوا میں بھگوئی ہوئی روئی چپکا دی گئی تھی۔ خواب آگیں روشنی میں اس کا سفید چہرہ بڑا پاکیزہ معصوم اور سہانا سا لگ رہا تھا!۔ جیسے فرشتوں نے اپنے پروں کا اس چہرے پر سایہ کر رکھا ہو!—

پھر چند لمحوں کے لیے وارڈ میں گہری خاموشی طاری رہی!— رازی نے ماحول کا تناؤ ختم کر دیا۔ ایک طویل طمانیت انگیز سانس لے کر بولا۔

"اچھا بھئی۔ تمہاری کیا رائے ہے—؟ مس زیدی خدا کے فضل سے ٹھیک ہیں!"

میں یہاں ٹھہرا رہوں یا پھر — جیسی تمہاری سب کی مرضی ہو! —"

"میں تو یہیں رہوں گا۔ پروفیسر صاحب! —" فرمان جلدی سے بولا۔

"میں اکیلی کہاں جاؤں گی؟" عائشہ بولی "میں بھی یہیں رہوں گی!" —

"تو پھر تمہاری بھی یہاں کیا ضرورت ہے۔ رازی — ؟" شفقت نے کہا۔ "انشاء اللہ رات بھر میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہوگی کہ کسی قسم کی تشویش ہو۔ تم تھکے ہوئے ہو گئے۔ آرام کرو۔ میں ان دونوں کے عارضی قیام کا بندوبست کر کے خود بھی واپس چلا جاؤں گا!!" —

"بی بی عائشہ — آپ کو ڈر تو نہیں لگے گا!" رازی نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی نہیں — !"

رازی نے شفقت کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"خدانخواستہ کوئی ایسی بات ہو تو مجھے فوراً ٹیلیفون کر دینا —"

"بہت اچھا — !"

"خدا حافظ جناب! —" فرمان نے کہا۔

"خدا حافظ — !" رازی ایک سرسری نظر عائشہ پر ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد فرمان نے اطمینان کی ایک بڑی طویل سانس لی اور شفقت کی طرف مسکرا کر انہیں گھبیائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"صاحبزادے — میں نے تم کو بچا لیا۔" شفقت نے کہا "یقین کرو کہ بابا جان گھر میں ہیں اور غالباً تمہارا انتظار ہی کر رہے ہیں! — اگر میں ان سے کہہ دیتا —؟"

"میری تو جان نکل گئی تھی۔ بھائی صاحب! —" فرمان بولا۔

"اچھا خیر" شفقت نے کہا "یہ تو بتاؤ۔ تم لوگوں نے کچھ کھایا پیا بھی ہے؟ —"

"سارا کھایا پیا تو انہی نے نکال لیا" عائشہ بولی۔

مجھے تو بہت بھوک لگی ہے!۔" فرحان نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
شفقت اُٹھ کر باہر گئے اور پتہ نہیں کیا کچھ خرید لائے۔
تم لوگ کھا پی کے سو رہو۔ میں ڈاکٹر سے ملتا ہوا جاؤں گا!۔ فکر مت کرنا۔
میں نے بابا جان سے کہہ دیا ہے کہ تم سب کل واپس آرہے ہو؟۔" شفقت نے کہا۔
بھائی صاحب۔ سچ مچ آپ بہت اچھے ہیں!۔" فرحان مسکرا کر بولا۔
ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اب تم کھاؤ!۔" وہ ہنس کر باہر چلے گئے۔ نرس سے مل کر ڈاکٹر کے چیمبر میں پہنچے اس نے انھیں اطمینان دلا دیا کہ فکر و پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ وارڈ میں واپس آئے تو دیکھا کہ فرحان اور عائشہ بڑے انہماک سے کھانے میں مشغول ہیں۔

وہ بڑی آہستگی سے صالحہ کے پہلو میں ٹک گئے۔ صالحہ اب بھی گہری نیند میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کے شستہ ہوئے رخساروں پہ سیاہ گنیری پلکوں کا ہلال نما عکس منجمد تھا۔ لب بہم دا تھے۔ بال تکیئے پہ پھیلے ہوئے۔ ہسپتال کے سفید لباس میں لپٹی وہ بہت پاکیزہ اور مقدس لگ رہی تھی!۔
شفقت نے چپکے سے اس کا ٹھنڈا ٹھنڈا ہاتھ اپنے گرم اور مضبوط ہاتھوں میں دبا لیا۔
صالحہ۔ کاش میں تمھیں بتا سکتا کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہے؟۔
اُن کی پرنم آنکھیں اس کے ملکوتی چہرے پر جم گئیں۔
دل چیر کر دیکھا نہیں جاتا۔ وہ جذبات کبھی ہمیشہ دل کی اندرونی دلدلوں میں دفن رہتے ہیں جو ہزار چاہیں کبھی تو لبوں پہ نہیں آ سکتے۔ اس چیز کے لئے بیتابی کیسی جو ملنے والی نہ ہو۔
صالحہ ایسی بے خبر سو رہی تھی کہ اسے کوئی احساس ہی نہ ہوا۔ انھوں نے چپکے

چیکے اس کے ماتھے پر سے بال سمیٹے۔ بٹی درست کی۔ گال سہلائے۔ خواہ مخواہ ہنسے۔ بے وجہ پلکیں جھپکوئیں ۔۔ اور گم صم بیٹھے اُسے تکتے رہے!۔۔

فرمان اور عائشہ نے حلق تک بھر لیا تھا۔ بیرا چائے لے آیا۔ چائے پی کر وہ تازہ دم ہو گئے۔ فرمان ایک پیالی شفقت کے لئے بھی لے آیا۔

بھائی صاحب آپ نے تو جلا لیا ۔۔۔" وہ بولا "بے حد مزے دار چیزیں تھیں ۔۔"

"خیر وہ تو سب ٹھیک ہے۔ رات کو اکیلے رہو گے تو نہیں؟" ۔۔ انہوں نے پوچھا۔

نہیں تو۔ محترمہ بھی تو ساتھ ہیں!" ۔۔۔ فرمان نے کہا

محترمہ عائشہ ہیں ۔۔ شفقت کو ہنسی آگئی ۔ ارے پگلی کی گئیں تو محترمہ کب سے ہو گئیں ۔۔؟

"کسی نہ کسی کو تو ادب کرنا ہی چاہئے ۔۔" عائشہ نے کہا "میں تو تب تک یہ کہتی رہوں گی!" ۔۔

"اچھا بھئی ۔۔ اب میں بھی چلتا ہوں۔ ہو سکا تو رات کو ایک چکر اور لگاؤں گا گھبرانا یا پریشان مت ہونا۔ ڈاکٹر نے تو ہر طرح کا اطمینان دلایا ہے ۔۔" پھر شفقت بھی گئے ۔ اور دونوں سب سرو سامانی کی حالت میں اسٹول اور تپائی پر بیٹھے رہ گئے۔

تھوڑی دیر بعد عائشہ جاگی۔ ڈاکٹر اسے دیکھ گیا۔ اور انہیں ہر طرح کا اطمینان دیا!

"اپی اب تو سر میں درد نہیں ہے؟" ۔۔ فرمان نے پوچھا۔

میرے پاس ملازمہ کافی تھی۔ فرمان! تم لوگ کتنی تکلیف اٹھا رہے ہو۔ بھلا یہاں کہاں لیٹو گے۔ کیسے سوؤ گے ۔۔" عائشہ بولی اس کے لہجے سے گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا!۔۔

بس اپنی اس کی فکر نہ کیجیے۔ چکر بڑھ جائے گا۔ آپ کھانا کھا کے آرام کیجیے
ہم گھر والوں کی پرسش اور گوشمالی سے بچ گئے۔ یہ تو کیا کم ہے!" فرمان ہنسا۔
عائشہ نے اُسے گرم کافی اور چند بسکٹ کھلائیں۔ عالیہ پر تکان غالب تھی۔ وہ
پھر سو گئی۔

شفقت گھر واپس آئے تو انھیں تنہائی اور ویرانی کا شدت سے احساس ہوا
خاموشی سے جا کر اپنے کمرے میں لیٹ گئے۔

بیگم زیدی کو کچھ پتہ نہیں تھا! — وہ اپنی فکروں میں غرق تھیں۔ انھوں نے بیگم
امتیاز سے ساری باتیں کہہ دیں۔

"بیکار وہم کرتی ہو —" انھوں نے جواب میں کہا: "ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ
گھر آئے مہمان کو اشفاق بھائی نکال باہر کریں۔ وہ تمھارے حقیقی بھائی بھاوج ہیں!"

"مگر وہ جس مقصد سے آ رہے ہیں۔ اس کا تذکرہ ہی انھیں غصہ دلا دے گا۔"

بیگم زیدی بولیں: "وہ تو شروع ہی سے بھائی صاحب کو بے علم اور بھائی جان کو جاہل
مطلق اور بدعقل سمجھتے ہیں! — تم دیکھ لینا کہ اب کوئی نہ کوئی بات ضرور اٹھ کھڑی ہو گی
"کچھ بھی نہیں ہو گا —" بیگم امتیاز نے کہا: "تم نے اشفاق بھائی کو پتھر سمجھ لیا ہے
اُن میں بس یہی خرابی ہے کہ بے تحاشہ پڑھ لکھ کر سنکی اور جھکی بن گئے ہیں۔ مگر انھیں
معقولیت سے سمجھاؤ تو مان جائیں گے!"

"بہن میں تو یہی ڈر رہی ہوں کہ اگر بھائی صاحب نے کہیں یہ کہہ دیا کہ میں
شمسہ کا بلایا ہوا آیا ہوں تب تو انھیں مجھ پر اور غصہ آئے گا!"

"تم کہہ دو اپنے میاں سے ساری بات۔ بلا سے — کچھ ہو — تمھاری وحشت
تو کم ہو"

"کون سنے میرا کہنا۔ میں تو خواہ مخواہ ایک مصیبت میں پڑ گئی ہوں" بیگم زیدی

نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "ارے ہماری دنیا کے بابوں کو دیکھا ہے کہ لڑکی کی شادی کی فکر میں خواب نہ خور اپنے اوپر حرام کیے رہتے ہیں۔ ایک میری قسمت میں یہ لکھے تھے۔ جلّاد — جو لڑکی کی شادی کو فضول۔ اور بے مقصد سمجھتے ہیں۔ دشادا انتیسواں سال اس کا چل رہا ہے۔ اب تو دشتہ بھی شادی کے قابل ہے۔ مختار پچاس برس اس کا ختم ہے۔"

"اللہ کوئی نہ کوئی صورت نکالے گا۔ گھبراؤ نہیں!"

"بس اللہ ہی میرے حال پر رحم کرے!" بیگم زیدی تھکے تھکے لہجے میں بولیں

اتنے میں ملازمہ نے چائے سامنے لا رکھی۔

"پتہ نہیں بچے کب واپس آئیں گے!" بیگم امتیاز نے پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کچھ ایسا میرا دل کمزور ہو گیا ہے کہ بچوں کی دیر تک جدائی نہیں سہہ سکتی۔ خیالات ہمیشہ برے آتے ہیں۔ لاحول پڑھتی ہوں۔ مگر دل کی دھڑکن بے چین کر دیتی ہے!"

"میں تو شروع ہی سے مخالف تھی!" بیگم زیدی نے کہا۔ "ایسی تفریح بھی کیا۔ جوان لڑکیاں غیر مردوں کے ساتھ گھر سے بیسوں میل دور ندی نالے جنگل پہاڑ گھومتی پھریں۔"

"مجھے خود کیا اچھا لگتا ہے۔ مگر نسرین کی ضد تھی۔ اب اس کا دل توڑنا کرنے کا بھی جی نہیں چاہتا!" بیگم امتیاز بولیں۔

دونوں میں دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوا کیں۔ مگر بیگم زیدی کے تفکر کا کوئی حل بیگم امتیاز پیش نہ کر سکیں۔

سہ پہر ڈھلنے لگی تھی۔ تب ان کی بے چینی حد سے سوا ہو گئی۔

"کیا بات ہے۔ بچے ابھی تک نہیں آئے!" زہرہ بیگم بھی بیگم زیدی کے ساتھ ان ہی کے ہاں چلی آئی تھیں۔

وہ تو کل اسی وقت آئیں گے۔ خالہ اماں! ۔۔" شفقت نے دخل دیا۔ چائے پینے اندر آئے تھے۔ عورتوں کی پریشانی اُن سے دیکھی نہ گئی۔

کل آئیں گے۔ مگر وعدہ تو کیا تھا کہ ۔۔۔۔۔" شمسہ بیگم نے کہا۔

جی ہاں۔ مگر کوئی نئی تفریح نکل آئی ہوگی! ۔۔" شفقت نے کہا۔ "خون پرازی صاحب نے اطلاع دی تھی۔۔ خیر کیا حرج ہے۔ بے چارے کب گھر سے نکلتے ہیں!"

میاں تم ہی ساتھ چلے جاتے۔ کچھ تو اطمینان رہتا! ۔۔" زہرہ بیگم نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

" میں تو تیار تھا خالہ اماں۔ مگر پریکٹیکل کے خیال سے بابا جان نے منع کر دیا۔" انھوں نے کہا۔

" بابا جان کی بھلی چلائی۔ اگر بچے پہاڑ پر چڑھنے کی خواہش کریں تو وہ منھ سے کچھ نہ کہیں گے۔ معلوم نہیں اللہ نہ کرے کوئی بات ایسی ہوئی ہو کہ یہ لوگ آ نہ سکے۔ دل عجیب طرح دھک دھک کر رہا ہے! ۔۔" زہرہ بیگم نے کہا۔ اور شفقت یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ماؤں کا دل جو کچھ بھی کہتا ہے۔ غلط نہیں کہتا۔ الٹے سیدھے چائے کے گھونٹ حلق سے اتارے اور جلدی سے اُٹھ کر باہر چل دئیے۔

شام ڈھلے زیدی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ گھر میں ہُو کا عالم طاری تھا۔ اکیلی شمسہ بیگم دالان کے تخت پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ وہ بھی اپنی فکروں میں ایسی غرق تھیں کہ انھیں ان کے آنے کی خبر نہ لگ سکی! ۔۔ وہ کھنکارے۔ اور بیگم نے بُرا سا منھ بنا کر سر اٹھایا۔

زیدی صاحب نے جوتے اتار کر ایک طرف اُچھالے۔ کوٹ اتار کر تخت پر پھینکا اور آہ بھر کر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گئے۔ بیگم تو جلی ہوئی بیٹھی ہی تھیں۔ جان بوجھ کر اُن کی خیریت نہیں پوچھی۔ بالآخر انھیں خود ہی کہنا پڑا۔

"کتنا سناٹا طاری تھا گھر بھر میں۔ لاحول ولا قوۃ کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے"
بیگم کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔
"سناٹا تو مقدر ہے۔ کون سی بیٹیاں کس کے گھر میں آباد رہتی ہیں ــــ!"
"استغفراللہ۔ پھر وہی بات! ــــ" وہ بھنا گئے "میں دیکھ رہا ہوں کہ جیسے
جیسے تمہاری عمر میں اضافہ ہو رہا ہے عقل گھٹ رہی ہے کیا تک ہے بھلا اس بات کا۔
ایک اور شوشہ تم نے آپ نکالا ہے۔ میں تو یہی جانتی ہوں کہ بیٹیاں ہمیشہ پرایا دھن
سمجھی جاتی ہیں۔ اور ایک نہ ایک دن ان کی شادی ہوتی ہے!"
"ہائیں ہائیں۔ یہ آج تم کدھر ہو ــــ" وہ حیران ہو کر بولے "کس بات
پر غصہ آرہا ہے۔ نہ وقت نہ موقعہ۔ کون بیوقوف یہ سمجھتا ہے کہ لڑکیاں اپنے
گھر میں اجاڑ دانے کے لئے ہیں!"
"آپ سمجھتے ہیں ایسا!" وہ بھنا کر بولیں "ہزار پیغام عاقلہ کے آئے مگر کان
پر جوں نہ رینگی۔ اب میں نے بھائی صاحب کو لکھ دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ فردوس
کے بھائی سلام احمد بہت اچھے آدمی ہیں۔ گھرانا تو دیکھا بھالا ہے۔ بات پکی ہو جائے
تو لڑکے کو بھی ہم دیکھ لیں ــــ!"
زیدی صاحب اس طرح اپنی بیوی کو دیکھنے لگے جیسے ان کے صحیح الدماغ ہونے
میں انھیں شک ہو۔ پھر وہ چپ ہو گئیں تو انھوں نے ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا۔
"واقعی احمق ہو۔ ارے ابھی کون گڑیا سوچ رہا ہے کہ آزاد فضا وں
میں بلند اڑانیں رکھنے والی خوش رنگ چڑیا کے بال و پر کاٹ کر اسے آہنی قفس
میں قید کر دیا جائے۔ بیگم تم بہت بھولی ہو۔ زمانے کی اونچ نیچ نہیں جانتیں۔
دنیا بہت آگے نکل گئی ہے۔ وہ پہلے کا سا دور نہیں رہا۔ میں ایم۔ اے
تھا اور تم بالکل ان پڑھ تھیں۔ مگر میں نے مخدومات ان کبھی نہیں کی۔ سادہ زندگی خاموش

کاٹ دی۔ آج کل کے لڑکے سب سے پہلے لڑکی کی تعلیم دریافت کرتے ہیں۔"

شمسہ بیگم کو غصہ آگیا: "ہاں ہاں تو اسی جاہل مطلق لٹھ کے ساتھ آپ نے ساری زندگی ہنسی خوشی کاٹ دی کہ نہیں۔ یہ میں ہی تھی کہ آپ کی ہر جا بے جا کو شتر کے گھونٹ کی طرح پیتی گئی اور اُف نہ کی۔ اگر میں کہیں ایم۔ اے ہوتی تو آپ کی پہلی ہی خفگی پر سارے گھر بار کو چولھے میں جھونک کے چل دیتی!"

"ہاں تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ میں تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھا!..... میں نے گھر نہیں بگاڑا۔ تمہارے ہر ستم برداشت کئے!" زیدی صاحب کو بیگم کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہی ٹھیک ہے۔ اسی طرح گفتگو کا رُخ مڑ جائے اور بیگم کو صائمہ کی شادی کا خیال نہ آئے۔ مگر وہ کچی گولیاں نہیں کھیلے تھیں۔ زیدی صاحب کے تبسم نے انھیں آتش زیر پا کر دیا۔

"آپ یہی چاہتے ہیں کہ بیکار کی باتوں میں یہ تذکرہ ٹل جائے۔ دیکھئے میں کہے دیتی ہوں کہ اگر بھائی نے مناسب رشتہ لا کر دیا تو چوں چرا نہ کیجئے گا۔ یہ خیال دل سے نکال دیجئے کہ وہ امریکہ جاکر ہیاڈ برابر ڈگری لائے گی۔ اور ایک دن ہندستان کی بادشاہ بنے گی۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اس قدر زیادہ پڑھ جائے کہ اس کی ٹکر کا شوہر کہیں نہ ملے ۔۔۔"

"شمسہ اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو کہ ابھی میرا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے" انھوں نے بے حد سنجیدہ ہو کر کہا: "اولاد میری ہے اور میں اس پر ہر قسم کا حق رکھتا ہوں کہ چاہے پڑھاؤں چاہے کہیں بیاہ دوں! صائمہ میری آئیڈیل لڑکی ہے۔ میں اس میں ایک بلند مرتبہ شخصیت کو پوشیدہ دیکھ رہا ہوں۔ اس کی شادی کر کے میں آزادی زائل کرنا۔ پڑھائی میں رخنہ لگانا اور اس کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو مغلوب کرنا نہیں چاہتا..... میں تم سے کہہ دوں کہ مجھے کوئی اپنے ارادے [illegible]

رکھ سکتا۔ تمہارے بھائی صاحب اپنے ساتھ دس رشتے بھی لائیں اور سب کے سب آسمان سے اترے ہوئے فرشتے ہوں تب بھی نہیں! ۔۔۔

"آخر آپ کی سمجھ کو کیا ہو گیا ہے ۔۔۔" وہ جھنجلا کر بولیں: "کیا آپ نے یہ طے کر دیا ہے کہ خدانخواستہ۔ اسے کنواری ہی بڑھیا کر کے چھوڑیے گا؟۔"

"جہالت کے پردے تمہاری موٹی عقل پر پڑ گئے ہیں": زیدی صاحب نے کہا "بس تم یہ چاہتی ہو کہ جس طرح جاہل، مطلق رکھ کر تمہارے والدین نے تمہیں میرے سر منڈھ دیا اور ساری زندگی تمہاری اپچے دیتے گزر گئی اسی طرح میں اپنی بیٹی کا انجام بھی کر دوں۔ ایک نا قدر شناس کے پلے منڈھ جائے اور اس کے بعد رہی بچی حشرات الارض کی ماں کہلائے ۔۔۔! میں جو بڑے بڑے خواب دیکھ رہا ہوں وہ یونہی بے تعبیر رہ جائیں ۔۔۔"

"میں آپ کی ایک نہ سنوں گی۔ آپ کے خوابوں کو آگ لگے۔ کیا ساری عمر آپ لڑکی کی طرف سے ہوئے خواب ہی دیکھے جائیں گے۔ اس کے جذبات کا کوئی پاس لحاظ نہیں کریں گے۔ اگر وہ چاہتی ہو کہ اس کی شادی کر دی جائے تو؟"

ہرگز نہیں ۔۔۔ وہ ایسا ہرگز نہیں سوچ سکتی! ۔۔۔" زیدی صاحب نے کہا! اور دو ٹوک لہجے میں بولے: "تم یہ بھی سن لو کہ اگر تمہارے بھائی صاحب نے بھی مجھ پر اس سلسلے میں کوئی ناگوار دباؤ ڈالا تو میں اتنے دن گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ جتنے دن وہ یہاں قیام فرمائیں گے! ۔۔۔"

یہ کہہ کر زیدی صاحب، تھکے اور پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے۔ شمسہ بیگم کا خون کھول رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیسے ہٹ دھرم آدمی کو قائل کریں۔ حیرت سے مارے سن تھیں۔

اس رات شمسہ کے مارے انہیں نیند ہی نہیں۔ کھانا بھی برائے نام کھایا۔

بیگم امتیاز وجہ پوچھتی رہ گئیں۔ کئی بار تو اُن سے جی میں آئی کہ انھیں سب کچھ سنا دیں، شاید وہی کوئی راہ نکالیں۔ پھر سوچا کہ یہ بھی بے فائدہ ہے۔ زیدی صاحب کی ضد اور خود رائی سے وہ اچھی طرح واقف تھیں۔ بے چاری ساری رات بے چین رہیں۔

زیدی صاحب لائبریری سے واپس آئے۔ ملازم سے منگوا کر کافی پی اور پھر آرام کرسی پر لیٹ کر سر رضا علی کا "اعمال نامہ" کھول لیا۔

"آگ لگے کتابوں میں" بیگم زیدی نے پردہ سرکا کر انھیں مزے سے کتاب میں غرق دیکھ کر دانت پیسے "انہی کم بختوں نے بھیجہ خراب کر رکھا ہے!" اور پھر سے پردہ کھینچ کر بستر پہ آ لیٹیں۔

دوسری صبح ناشتہ کی میز پر سب تھے۔ بیگم امتیاز اور امتیاز صاحب بھی آ گئے تھے۔ اکثر وہ لوگ ساتھ ہی کھاتے پیتے تھے! بیگم زیدی بدستور خفا تھیں! —

"کوئی فکر آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ بھابی!" امتیاز صاحب نے بیگم زیدی سے پوچھا۔

"مجھے کہاں کوئی فکر۔ پانچوں گھی میں سر کڑھائی میں" وہ جل کر بولیں۔ "خانہ خراب ہو اُجڈ جاہل کا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے میں آ کر —!"

"ہائیں ہائیں — یہ آپ کو کیا سوجھی ہے" امتیاز صاحب حیرت سے بولے "یعنی واقعی آپ ہفتہ بھر کی بیاہی لڑکی کی طرح پھول رہی ہیں — اشفاق! — یار — کیا معاملہ ہے؟ —"

"معاملہ؟ —" ان کے منہ میں اُبلا ہوا پورا انڈہ تھا! — موٹی آواز میں بولے "میں کچھ نہیں جانتا! — انہی سے پوچھیے۔ رات سے میری کھوپڑی کھا رکھی ہے کہ بس اب لڑکیوں کی شادی کر دینی چاہئے۔ غالباً اپنے میکے والوں کو بھی دعوت دی ہے نہ مجھ ناسمجھ، جاہل اور احمق انسان کو سمجھانے اور نشیب و فراز

سے آگاہ فرمانے آنے والے ہیں۔ سچ کہا ہے کسی نے۔ عورت چاہے بقراط کی بیوی ہو یا افلاطون کی۔ وہ ہر حال میں عورت اور ناقص العقل ہی رہے گی!۔"

"اشفاق بھائی ۔ ناقص العقلی کا ثبوت تو آپ دے رہے ہیں!۔" بیگم امتیاز بولیں "آخر پرایا دھن کب تک اپنے پاس رہے گا۔ آپ نہیں جانتے اگر جائز دور پر ایک بات نہ ہو جائے تو آگے بڑی خرابیاں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ اور تب کچھ بنائے نہیں بنتا!۔"

"ارے بہن ۔ بیکار کے خیالی وہموں کے بھوت تم لوگوں نے گھر رکھے ہیں ۔ میں سینکڑوں مثالیں ایسی دے سکتا ہوں کہ جہاں لڑکی شادی کے بغیر ساری زندگی نہایت مزے میں گزار لے گئی ۔ ماشاءاللہ صالحہ تو ایک متمول گھر کی لڑکی ہے۔"

"دیکھئے بھائی آپ نے غلط بات کہی ہے ۔" بیگم امتیاز بولیں " لڑکی کی شادی کو تمول و غربت کے بہانے نہ ٹالئے ۔ صالحہ خدا کرے سونے کی سیج پر سوئے ۔ مگر آخر بڑے بڑے شہنشاہوں نے اپنی لڑکیاں کیوں بیاہ دیں؟۔ انھیں کس چیز کی کمی تھی ۔ اور پھر یہ تو سنت ہے ۔ شرع واسلام کی پیروی ۔۔ لڑکی کا بسر کرنا پڑتا ہے!۔"

"تم اپنے لائے نظر نے نہیں ۔ لڑکی کے دماغ سے سوچو۔" امتیاز صاحب نے کہا۔

"بھنگ پی گئے ہو تم؟۔" زیدی صاحب نے کہا " کون لڑکی یہ چاہے گی کہ باپ کے گھر احسانیں چھوڑ کر شوہر کے گھر کی سختیاں جھیلے!۔"

"زیدی ۔ کیا ماں باپ لڑکی کے لئے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں؟۔" امتیاز صاحب نے کہا " کوئی دنیا میں قیامت تک بیٹھا نہیں رہتا ۔ معلوم نہیں کہ کب کس کا بلاوا آجائے ۔ اپنے پیچھے جوان ہوشمند اور سمجھدار لڑکیوں کو دنیا بھر کی انگشت نمائی کے لئے بے سہارا چھوڑ دینا کتنی بڑی سنگدلی اور بے رحمی ہے۔ مرنے والے اپنے ان

مر جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنے زندہ اور پریشان حال عزیزوں کو دیکھنے واپس آتے ہیں۔

اول تو میں ابھی مرا نہیں جا رہا۔" زیدی صاحب نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "دوم یہ کہ تم سب سمجھتے ہو میرے بعد میری اولاد بھیک مانگے گی تو ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے کافی جائداد ـ دونوں کے نام لکھی ہے۔ کوٹھیاں ہیں باغات!"

امتیاز صاحب نے بیگم زیدی کو دیکھا۔ جن کے چہرے پر کئی رنگ آ رہے تھے جا رہے تھے۔ انھوں نے زیدی صاحب کی بات کاٹ کر کہا

"خیر بھابی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ان کا تو دماغ ہی الٹ گیا ہے۔ اب آپ جانتی ہیں کہ صالحہ آپ کی نہیں۔ بلکہ میری بیٹی ہے۔ آپ اسے مجھے دے چکیں۔ اب اس کا باپ میں ہوں۔ اگر میں کوئی رشتہ معقول دیکھوں گا تو خود صالحہ کی شادی کروں گا۔ اگر ان کی مرضی ہو تو شادی میں شریک ہوں ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں!"

"اچھا۔ اچھا!" زیدی صاحب نے قہقہہ لگایا۔۔۔

ان کے چلے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک وہ سب انھی کی بد دماغی پر تیز انداز میں تبصرہ کرتے رہے!۔۔۔

شفقت کیا میز پر تھے۔ وہ شروع سے آخر تک سب سنا کیے۔ پھر جب ناشتہ ختم ہوا تو وہ صالحہ کو دیکھنے اسپتال چلے گئے

سہ پہر تک صالحہ، عائشہ اور فرحان گھر واپس آگئے۔ ملازمہ بھی ساتھ تھی۔ اس کا منہ بند کرنے کے لئے شفقت کو اُسے ایک معقول رقم دینی پڑی تھی!۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ کسی سے کچھ نہ کہے گی!۔

صالحہ ابھی کمزور ہو رہی تھی!۔ جانے سے پہلے ڈاکٹر نے اسے ایک انجکشن دیا اور وہ نرس کے سہارے ٹیکسی میں جابیٹھی!۔ ابھی وہ لوگ روانہ نہیں ہوئے تھے کہ رازی صالحہ کی پرسش کے لئے پہونچ گیا۔

"اوہ۔ خدا کا شکر ہے۔ آپ گھر واپس جارہی ہیں۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اُس نے براہِ راست صالحہ سے پوچھا۔

"شکریہ۔ اب تو ٹھیک ہوں!" صالحہ اس کی گرم نگاہی سے گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"اچھا۔ رازی پلیز۔ اب اجازت دو۔" شفقت نے اس کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "دیر ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں بھی انشاء اللہ کل پرسوں آؤں گا۔" اُس نے کہا اور سر خم کر کے الوداعی سلام کیا۔

"مسٹر۔ پلیز۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں آپ کے منہ سے بابا جان یا ڈیڈی کے سامنے کچھ نکل جائے۔"

فرحان بولا۔ رازی ہنسنے لگا۔

"نہیں نہیں۔ تم گھبراؤ مت؛۔ میں خیال رکھوں گا۔" اور اسے اطمینان

دلا کر رخصت ہوا۔ "تمہیں کچھ کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ صالحہ!" شفقت نے پوچھا "تمہارا چہرہ اداس ہے۔ گم صم ہو بالکل ..." بے رازی کے ساتھ ہی وہ سب بھی ہسپتال سے نکلے۔

"جی نہیں" وہ مسکرائی "نہیں تو ... میں تو بالکل اچھی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے کوئی دیکھا ہوا پلاٹ سلجھا رہی ہوں؟" فرمان بولا۔ "پھر کچھ سوچ کر کہا "تم میں بہت نالائق ہوں۔ صرف میری ہی وجہ سے ابی کو اتنی تکلیف پہنچی ہے۔ اب میں اپنے سر پر بھی کوئی چیز مار کر اتنا ہی خون بہاؤں گا۔ جتنا ابی کا بہا ہے۔ وہ کوئی شعر ہے نا اس قسم کا۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد

بیوقوف ہو تم ..." صالحہ ہنس پڑی "در اصل غلطی میری ہی تھی! میں پکچر میں ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ مجھے راستے کے نشیب و فراز کا بھی خیال نہیں رہا!"

"سبحان اللہ ..." فرمان نے داد دی "کیا افسانوی انداز کلام ہے یقیناً آپ کی تحریر بھی ایسی ہی ہو گی۔ آپ کا پہلا ناول کون سا چھپ رہا ہے۔ وہ میں فوراً پڑھوں گا۔ میرا ایڈریس ابھی سے نوٹ کر لیجئے ...!"

راستہ بھر فرمان اور عائشہ باتیں کرتے رہے۔ صالحہ کتنی اچھی لگ رہی ہے ہیر لباس میں بیٹھی۔ بکھرے بال۔ پپڑیاں پڑے لب۔ کملایا ہوا سادہ سی۔ معلوم نہیں یہ پیاری سی لڑکی کس کے نصیب میں ہے؟ ...

"آہ کاش ... میں کسی قابل ہو سکتا! ..." بے حد بے چین خیالات انھیں ستانے لگے۔ ایک دن ایسا آئے گا کوئی خوش نصیب صالحہ کا ہاتھ تھام کر اپنی راہیں پر لے کر چلا جائے گا۔ اس کے ماموں آنے والے ہیں۔ اگر کوئی اچھا رشتہ لے آئے تو زیدی صاحب بھی سب کے سامنے مجبور ہو جائیں گے۔ یہ نا ممکن ہے کہ وہ

لڑکی کو ساری عمر بٹھائے رکھیں۔ اب تو وہ صرف ہٹ دھرمی کر رہے ہیں

پھر صالحہ دلہن بنے گی۔ اور شور و غل کے طوفان میں رخصت ہو جائے گی۔

اور میں ـــ ان کے لبوں پر ایک سسکی مچل گئی ـــ

میں حرماں نصیب۔ اپنے اندھیرے کمرے میں پڑا سیلابِ آنسوؤں سے اپنا تکیہ بھگوتا ہوں گا۔ تب میری حیاتِ بے ثبات میں کتنا بڑا خلا آ جائے گا۔ تب زندگی میں کون سی رعنائی باقی رہ جائے گی۔ تب جینے کا کیا جی چاہے گا؟۔ کون اس بے دل میں جھانک کر دیکھے گا۔ کسے میرے احساسات کا پتہ چلے گا۔ یہاں کون ہے جو آنکھوں کی زبان پڑھ سکے۔ جو دل کے رازوں سے واقف ہو۔ جسے احساس ہو سکے کہ میں بھی انسان ہوں اور محبت سے لبریز دل رکھتا ہوں۔ ٹیکسی کوٹھی پر پہنچ کر رک گئی۔ ایک ہلکے سے جھٹکے سے ان کے خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ انہوں نے طویل سانس لے کر گرد و پیش پر ایک نظر ڈالی۔ سب کچھ جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ یہ بڑے لمبے سرو کے درخت، یہ کراٹا کے وحشی ہاتھی۔ یہ لان پر بچھی سبز مخملی ہری ہری لیٹی ہوئی گھاس۔ یہ زرد دیوار ـــ یہ گھر ـــ سب کچھ ایک سا ہے۔ اداس۔ قبر کی مانند خاموش اور سوگوار ـــ چاروں طرف زرد زرد دھوپ پھیلی پڑی ہے سارے ماحول پر۔ ماحول افسردہ ہے۔

سب اتر چکے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اتر کر ان کے لئے پٹ کھولا۔ اور وہ بے دلی سے آہستہ سے اتر پڑے۔ کرایہ چکایا۔ معلوم نہیں کتنا دیا کہ ڈرائیور نے تعجب سے ان کی شکل دیکھی۔ زیرِ لب مسکرایا۔ اور ایک زمین دوز سیلوٹ کر کے پھر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا! ـــ

وہ تھکے ہوئے قدموں سے اوپر چڑھ گئے۔

بیگم زیدی صالحہ کو دیکھ کر دنگ سے رہ گئیں۔

"اُو ئی بیٹی - خاک ڈالوں ایسی تفریح پر - ارے تم صحت بنانے گئی تھیں کہ بیمار ہونے ؟ - زہرہ بہن - ہائے - خدا کے لئے دیکھئے - میری بچی کو کیا ہوا ہے - یہ زرد ہوئی آتی ہے - جیسے خدانخواستہ چھ مہینے کی بیمار رہی ہو ؟ -"

صالحہ کا چہرہ فق ہوگیا - فرمان الگ زرد ہو رہا تھا ! -

بیگم امتیاز نے صالحہ کو سینے سے چمٹالیا - "دو دن پان تو ہیں معلوم نہیں سب کے ساتھ پہاڑوں پر چڑھی ہے کہ ڈھلانوں میں اُتری ہے - تھک گئی ہے - بی بی بیٹا - تم میرے ساتھ چلو - میں اپنے ہاتھ سے تمہیں گرم گرم پانی سے نہلاؤں - اور تھپک تھپک کر سلادوں ! -"

صالحہ ہنسنے لگی : "مجھے کچھ بھی نہیں ہوا امی - میں تھک گئی ہوں - بس ! -"

فرمان ! - آپ کی بیگم امتیاز اس پر خفا ہوئیں : "دیکھو میاں - میں کہے دیتی ہوں : آئندہ کبھی میں اتنے دن گھومنے پھرنے کسی کو نہیں جانے دوں گی - تم لوگ ہو - بندروں کی طرح درختوں پہاڑوں پر چھلانگیں لگاتے ہو - سچ بتاؤ - میری بچی کا یہ حال کیسے ہوا - راتوں کو سوئی نہیں کہ ڈھنگ سے کھانا نہیں ملا ؟ -"

اچھا امی چلئے پلیز ... " صالحہ فرمان کا ستم طلب چہرہ دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی : "آپ مجھے نہلا دیجئے پھر میں آپ کے نرم نرم بستر پر آپ کا کاف اوڑھ کر سو جاؤں گی - شام تک ٹھیک ہو جاؤں گی ! -"

بیگم امتیاز بھی اٹھ گئیں اور فرمان سے بولیں : "میرے پیچھے نہ آنا بیکار کی ہو حق کرنے کے لئے - پہیں کچھ دیر اور سو جاؤ ... خبردار ... ! "

اچھا امی اچھا ... " وہ خوش ہوگیا - بیگم امتیاز صالحہ کو لے کر چلی گئیں -

بیگم زیدی نے ملازم سے کہا کہ وہ گرم کافی لے آئے اور خود عصر کی نماز پڑھنے چلی دیں -

جان بچی لاکھوں پائے " فرمان کے سر سے خطرہ ٹلا - بے حد ہلکا پھلکا ہو کر

بولا "اور جناب آپ..... آپ کو کسی نے ڈانٹا ڈپٹا نہیں۔ ممی مجھ ہی کو خفا ہوئیں!"
عائشہ نے توبہ کرنے کے انداز میں گال تھام لئے "آئندہ کے لئے کان پکڑے۔
یہ سوچ کر میرا کلیجہ نکلتا ہے کہ اگر سب کو معلوم ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ باجی سچ مچ بہت
کمزور ہو گئی ہیں۔ خدا انھیں جلدی اچھا کرے!"

"مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ باجی کے برخلاف آپ نہایت صحت مند، سرخ و سفید
اور موٹی تازی ہو کر رہ گئی ہیں۔" وہ غرائی "اپنی صورت آئینہ میں نہیں دیکھی
بالکل چقندر بنے ہوئے ہو۔"

فرمان کو ہنسی آ گئی "آپ میں جمالیاتی ذوق بالکل نہیں ہے۔ اگر آپ کہتیں
تو یہ کہتیں کہ میں بالکل کشمیری سیب ہو رہا ہوں یا پھر قندھاری انار معلوم ہوتا ہوں
معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو پھیکے سیٹھے چقندر ہی پسند ہیں۔!"

ملازم کافی لے آیا۔

"اب تو میں بھی سو جاؤں گا۔" فرمان نے ایک گھونٹ لے کر کہا "ساری
رات جاگا ہوں۔"

"جھوٹ بھی بولنے لگے۔" عائشہ بولی "ارے تم جاگے ہو! میں ہی۔
تم تو ایسے گھوڑے بیچ کے نیند کے، اسٹول پر ٹک کر سو گئے۔"

"اور آپ؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"میں۔ میں کہاں سوتی۔ بھلا وہاں کوئی جگہ بھی تھی؟ ڈاکٹر الگ مجھ پر خفا
ہوا کس کی اجازت سے آپ دونوں یہاں رہے ہیں۔ تمھارے پروفیسر صاحب
بالکل احمق معلوم ہوتے ہیں انھوں نے ہم سب کے رہنے کی اجازت نہیں لی۔ مشکل میں
نے ڈاکٹر کو راضی کیا تھا۔ تم پڑے سو رہے تھے۔ میں تو رو دی تھی!"

"یہ کام البتہ آپ نے اچھا کیا!" فرمان نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ آئندہ بل

کا تو اب آپ مجھے کھینچ دیں تو اور اچھا کریں۔"

عائشہ خاموشی سے چائے پیتی رہی۔

پھر دونوں اٹھ گئے۔ فرحان شفقت کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بیٹھے لکھ رہے تھے۔ مسکرا کر فرحان کی تقدیم کی۔

"بھائی صاحب" مجھے بے حد نیند آ رہی ہے۔ ممی نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں گھر گیا تو وہ لٹکا دیں گی۔ اور آپ ہی اندازہ لگائیے کہ میں الٹا لٹک کر زیادہ خوبصورت نہیں معلوم ہوں گا! اگر آپ اجازت دیجئے تو میں یہیں پڑ کے سو جاؤں براہ مہربانی جگائیے گا نہیں!"

"سنو تو سہی۔ کیا تمہاری ممی کو سارا قصہ معلوم ہو گیا" شفقت نے پوچھا

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ معلوم ہو جاتا تو بھلا وہ مجھے زندہ چھوڑ دیتیں؟" فرحان نے کہا اور ان کے بستر پر لیٹ کر کانوں تک لحاف کھینچ لیا۔

"تو پھر انھوں نے کیوں دھمکی دی تھی!"

"فقط اس لئے کہ اپنا کیوں اتنی کمزور نظر آ رہی ہیں۔ سچ پوچھئے تو میرا یہ اگر ممی مجھے الٹا لٹکا بھی دیتیں تو۔۔۔ تو۔۔۔ یہ ایسی بڑی سزا نہیں تھی۔۔۔ اچھا اب۔ بس میں سوتا ہوں۔۔۔"

پانچ منٹ میں سچ مچ اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

عائشہ بھی جا کر سو گئی۔ بیگم زیدی کچن میں چلی گئی تھیں۔ گھر میں سناٹا طاری تھا!۔ زیدی صاحب بھی آ گئے تھے اور حسب معمول دالان کے بیچوں بیچ آرام کرسی پر نیم دراز مطالعے میں مصروف تھے!۔

اتنے میں ملازم نے انھیں مہمانوں کی آمد کی خبر پہنچائی۔

زیدی صاحب تو جیسے بدحواس سے ہو گئے۔ بوکھلا کر پکارا "بیگم

لو بیٹی۔ وہ آ گئے ـــ" اور کتاب ریڈیو گرام پر پھینک کر باہر دوڑیں۔

بیگم صاحبہ بھی کچن سے بھاگیں۔ زوار حسین صاحب ٹیکسی سے اُتر رہے تھے ایک لاری بھر کے ان کا اسباب تھا۔ ٹیکسی سے اُترتے ہی انھوں نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

"لو میاں خیر سے بدھو گھر کو آئے کہاں ہیں میاں اشفاق؟ ۔ کلب ولب میں شکار کھیلنے تو نہیں چلے گئے۔ تار معلوم نہیں ملا۔ ملا تو ضرور ہوگا؟ ـــ"

کلب میں شکار؟ ـــ زیدی صاحب نے گھبرا کر سوچا؟ ـــ اور جھپٹ کر قریب پہنچے۔ سلام کیا۔ مصافحہ کے بہانے اپنی انگلیاں تڑوائیں اور پھر خاکساری سے مسکرائے۔

زوار حسین صاحب کی پرانی عادت تھی سوال خود ہی کرتے جواب بھی خود ہی دے لیتے۔ جو بھی اطمینان بخش معلوم ہوتا۔ اور طویل طویل قہقہے لگاتے ایسے کہ قہقہوں کی گھن گرج میں مخاطب کی منمناہٹ گم ہو کر رہ جاتی۔ ـــ"

بڑی بیگم زرق برق لباس میں ملبوس تھیں۔ بھاری بھاری زیور لادے ہوئے۔ ایک متحرک پہاڑی کی طرح دھم دھم کرتی آئیں اور بڑے تزک و غرور سے سب کے سلام کا جواب دیا۔ چشمی اور نرودس بھی ساتھ تھے۔ سیدھے سادے کپڑے پہنے۔ ہمیشہ کی طرح سادگی سے مسکراتے ہوئے۔ سب سے بہت تپاک اور خلوص سے ملے! ـــ

"بچیاں کہاں ہیں؟ ـــ" بڑی بیگم نے پوچھا۔ وہ سب اوپر پہنچ کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔

"جی ـــ وہ تھوڑی ہی دیر پہلے پکنک سے واپس آئی ہیں۔ غالباً سو رہی ہیں۔" زیدی صاحب نے جواب دیا۔ "آپ لوگ تھکے ہوئے آ رہے ہیں!۔ کچھ

غسلخانہ تیار کروا دوں؟"

"غسل خانہ؟" زوار حسین صاحب نے بلند آواز میں قہقہہ لگایا "میاں کون سی تھکن ہے کہ نہا کر اترے گی۔ ارے۔ آرام سے برتھ پر سوتے ہوئے تشریف لائے۔ ٹیکسی نے یہاں تک پہونچا دیا۔ پیروں کو ہم نے تکلیف ہی نہیں دی" یہ کہہ کر پھر ہنسے۔

"عشمت کو نہیں لائیں بھابی جان آپ؟" بیگم زیدی نے پوچھا۔

"اے لو۔ بھلا میں نہ لاتی؟" وہ اپنی بھاری آواز میں بولیں "کچھ دشمنی ہے تم سے۔ وہ تو خود بھی آنے کے لئے مچل رہی تھی۔ ہائیں رخصت کرتے وقت خوب روئی۔ مگر خاک پڑے اس کے سسر پر۔ جانے کہاں بھیجا کہ اُسے گھٹنے پہ فالج گرا پڑا ہے۔ بہو ہی اکیلی ہیں۔ پھر کیسے بھجوا دیں گے۔"

"بھابی صاحبہ آپ نے بھی اتنی سی لڑکی کو کیسے عجیب و غریب بکھیڑوں میں اُلجھا دیا ہے" بے اختیار زیدی صاحب کے منہ سے نکلا "مجھے تو بالشت بھر کی بچی یاد ہے۔ صحن میں بیٹھی ریت کے گھروندے بنایا کرتی تھی۔ وہ ماشاءاللہ چار بچوں کی ماں بن گئی ۔ ۔ ۔"

فخر و ناز کے مارے بڑی بیگم کا طباق سا چہرہ لال ہو گیا "میاں تم بھی خوب ہو۔ تمہارا کیا منشا ہے کہ وہ ماشاءاللہ بائیس برس کی بڈھی گھروندوں سے کھیلا کرتی۔ اللہ نے یہ دن کیا کہ بیاہ کر اول خاوند کے گھر گئی ہے۔ جیسے کنکر پتھر میں گودڑ لعل۔ چار لڑکوں کی ماں ہے۔ سارے خاندان میں سر اٹھا کر چلتی ہے۔ پتہ نہیں یہی دعا مانگتی ہوں کہ اللہ پاک ہر لڑکی کا نصیب ایسا ہی کرے!"

"آپ بجا فرماتی ہیں وہ بچی بالکل گڑیا سی تھی ۔۔۔" زیدی صاحب نے بات بدل کر پوچھا "اور کتنے دن ہیں [illegible] آپ کہ ۔۔۔ [illegible]"

مولانا آلِ حسین صاحب کی نواسی ہے۔" بھائی صاحب نے دخل دیا۔ "غالباً
یہ اکلوتی بھتیجی ظلِ حیدر صاحب کی ہے۔ یا شاید اور ہوں۔ غالباً ہیں! ۔ لڑکے البتہ
چار اور ہیں!"۔

"سبحان اللہ۔ اس علم دوست گھرانے کا کیا کہنا!" زیدی صاحب نے کہا اور
بھائی صاحب کے فخر و ابتہاج پر دل ہی دل میں لاحول پڑھ کر خاموش ہو گئے۔

فردوس اور حبشی ملازموں کے ساتھ مل کر اسباب مناسب جگہوں پر رکھوا رہے تھے۔
زیدی صاحب نے شفقت سے کہلوایا کہ وہ مہمان خانہ اور باہر کے کمرے جلد تر صاف
کروا دیں۔ دل میں وہ خائف تھے۔ پتہ نہیں یہ حضرات کب تک دھرنا دیں۔ وہ صرف
حبشی سے خوش تھے۔ جو نہایت شریف، اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوش مزاج اور مزاج داں تھے۔
بڑے بھائی صاحب اور بیگم صاحبہ کی بک بک سے اختلاج ہو رہا تھا۔

وہ کہہ رہے تھے: "بھائی تم تو کبھی چار سطریں خط میں لکھ کر نہیں بھیجتے۔ تمہاری سب
کی خیریت میں دل لگا رہتا ہے۔" پھر خود ہی جواب دیا: "غالباً مصروف رہتے ہو گے؟"

"جی ہاں۔ بس۔ یہی قصہ ہے!" زیدی صاحب نے کہا۔

"کاہے کی مصروفیت ہے!" بڑی بیگم کراری آواز میں بولیں۔ "یوں کہو کہ لکھنا
نہیں چاہتے۔ ویسے ہر وقت کتاب پر اندھا دھند [illegible] قلم ہاتھ میں لئے رہتے ہوں
گے۔ [illegible] اب جو کچھ کہو۔ جاہل ہوں تو کیا اور عالم فاضل ہوں تو کیا۔ رشتہ داری
تو ہے آپس میں۔ برسوں ایک دوسرے کی خیر و عافیت معلوم نہیں ہوتی تو کیسا لگتا
ہے؟ [illegible] کی [illegible] کے آئی ہوں کہ [illegible] حبشی اور [illegible]
[illegible] سال بھر رہو گے اور انشاء اللہ [illegible] بار [illegible] کے
[illegible]

[illegible] زیدی صاحب کے ذہن میں [illegible] خدشہ

سامنے آیا۔

"ارے بھئی۔ لڑکیوں کو جگاؤ ۔۔۔!" بھائی صاحب نے حکم دیا۔ "اب تو رات ہو رہی ہے۔ اب پڑی سوتی رہیں تو رات کو جاگیں گی۔" پھر خود سے بولے: "مگر اچھا خیر ٹھیک ہے۔ جی بھر کے سولیں۔ تازہ دم ہو جائیں گی۔

"کھانے میں کیا نوش فرمائیے گا؟" زیدی صاحب نے ازراہِ مہمان نوازی پوچھا۔

"ہاں خوب" بھائی صاحب نے گونجدار قہقہہ لگایا۔ "صاحبزادے۔ خاطروں پر آمادہ ہیں۔ لکھوا دو بیگم۔ کھانے پینے کی فہرست۔ اس وقت کھانے میں مرغ کے کباب مل جائیں تو واللہ لطف آجائے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ اس وقت کہاں ملے گا مرغ" بڑی بیگم نے بات کاٹ دی۔ "کل دیکھا جائے گا۔ بھئی۔ کھانا تو ہم سب نے مغرب کے بعد ہی ڈائننگ روم میں کھا لیا تھا۔ اب تو کافی پی کر سو رہیں گے۔۔۔"

زیدی صاحب کے حلق تک لقمہ بھر گیا۔ خدا کی پناہ۔ کس درجہ گنوار لوگ ہیں۔ ارے جب گھر ہی آرہے تھے تو ڈائننگ روم میں کھانا کھانے کا کیا تک تھا۔ مگر وہ خاموش رہے!!۔۔

بیگم زیدی نے ملازمہ سے کہہ کر لڑکیوں کو بلوا لیا۔ وہ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر آگئیں۔ ذوار حسین صاحب ان کے ماموں تھے۔ انھیں قدرتی محبت تھی۔ بڑے پیار سے گلے لگا کر دعائیں دیں۔ بڑی بیگم نے بھی سینے سے لگایا۔ اور مسکراتی رہیں! پھر صابحہ اور عائشہ بھی دونوں کو لے کر اپنے کمروں تک آگئیں۔ اور بزرگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے الگ بیٹھے رہے۔!!

ایک دو دن میں وہ سب آپس میں بے تکلف ہو گئے۔ ذوار حسین صاحب در اصل بیاہ کر بیٹے کے لیے تحفے بھی ساتھ اور زیدی کی شکل بھی لائے تھے۔ وہ بڑی خوشی

خوشی خوشی سبھوں کو عطا کئے۔ زیدی صاحب کے لئے بے حد بیش قیمت سوٹ کا کپڑا تھا اور بیگم زیدی کے لئے نہایت عمدہ بنارسی زرکار ساڑی۔

"اب بڑھاپے میں یہ کیا پہنوں گی۔ بھائی جان؟" وہ شرما کر ہنسی۔

"کہاں سے آ رہا ہے بڑھاپا؟" بڑی بیگم نے حیرت سے کہا "ارے ہمارے سامنے کی بچی ہو۔ جب میری شادی ہوئی ہے۔ بمشکل دو سال کی رہی ہو گی۔ گود میں کھلایا ہے تم کو۔"

"یہ صاحبزادے بھی نہایت قابل بنتے ہیں" بیوی کی تائید میں بھائی صاحب نے بے وجہ کا قہقہہ لگا کر کہا "یوں کہو کہ زیادہ پڑھ لکھ گئے اختر نے اعلیٰ درجات حاصل کئے۔ خدا ہمیشہ شاد رکھے۔ تم تو جانتی نہیں۔ مگر مجھے تو کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ چچا مرحوم نے ایک صبح آ کر یہ خوشخبری سنائی تھی کہ خالو مرحوم کے یہاں لڑکا ہوا ہے۔ میں بیٹھا اپنی تختی صاف کر رہا تھا۔ چھوڑ چھاڑ کر بھاگا۔ یہ موصوف بالشت بھر کے ہو، گدے پر پڑے ننھی ننھی سانسیں لے رہے تھے۔"

زیدی صاحب ہنسنے لگے:۔

"واقعی زمانہ ہوا کے دوش پر اڑا جا رہا ہے۔ کتنے لوگ اس عرصہ میں زمین کا پیوند ہوئے۔ کتنے اور لوگوں نے ان کی خالی جگہیں پُر کیں۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہوتا ہے ایک دن ہم بھی چل بسیں گے۔ رہے نام اللہ کا!"

"آپ کا دم غنیمت ہے بھائی صاحب! اب خاندان میں رہا ہی کون ہے جس سے دکھ درد کہا جائے۔" زیدی صاحب نے کہا۔ فی الواقع وہ ان سے خوش تھے۔ کیونکہ یہ بیش قیمت تحفے لائے تھے اور انھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی کہ زیدی صاحب کو گراں گزرتی۔ اب تو انھیں بھائی صاحب کی ذات سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ بڑے بزرگ ثابت ہو رہے تھے۔

بڑی بیگم نے بھی کوئی غصہ۔ رشتہ کا نہیں چھوڑا۔۔ وہ بیگم زیدی کے پاس اندر
ہی رہتیں۔ معلوم نہیں کیا گیا باتیں دونوں نند بھاوجیں میں ہوا کرتیں۔ بیگم نے اپنے
سارے مسائل ان کے سامنے رکھ دئے تھے۔ امتیاز صاحب کی بیوی سے بھی اس عرصہ
میں اُن سے بے تکلف ہو گئی تھیں۔ تینوں عورتیں بس ایک جان تین قالب تھیں۔
چھوٹوں کی کمپنی الگ تھی۔ حشمی اور فردوس کو ان لوگوں نے اپنے شہر کی بے تحاشہ
سیریں کرائیں۔ خوب خوب شوپنگ کی۔ نت نئے پروگرام بنتے۔ فرمان اور شفقت
بھی ساتھ ہوتے۔ حشمی بڑے وسیع القلب اور روشن خیال آدمی تھے۔ انھیں
در پردہ شفقت کے المیہ کا علم تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شفقت کو احساس کمتری
ستائے۔ پہلے پہل انھوں نے کسی حیلے بہانے سے معذرت چاہی تھی۔!

"دیکھئے مجھے سمینار سے نوٹس لینے ہیں!۔۔"

ہاں ہاں میں جانتا ہوں ۔۔۔ حشمی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا "ایک تم ہی نہیں
میں بھی اس پوزیشن سے گزر چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اسٹڈی کا سیزن کون سا ہوتا
ہے۔ پھر لے لینا نوٹس ۔۔ اب چلو ہمارے ساتھ!۔۔۔

"چلئے نا بھائی صاحب۔ آپ تو لڑکیوں کی طرح شرماتے ہیں" فرمان نے
کہا۔ اُسے سب کی موجودگی میں بڑا لطف آتا تھا!۔۔۔

انھوں نے بہت پس و پیش کیا مگر حشمی اور فرمان کے ساتھ ایک بہانہ بازی
کارگر نہیں ہوئی انھیں سب کا ساتھ دینا ہی پڑا۔

پکھراج بس بھی۔ جو بہت ہنس مکھ بے حد پیاری لڑکی تھی۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ
سب کے ساتھ رہیں۔ اُسے کم و بیش شفقت کے حالات کا علم تھا۔ وہ بہت متاسف
رہتی تھی!۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ جہاں سب لوگ لطف اٹھا رہے ہوں وہ
بیچارے تنہا پڑے گھٹتے رہیں!۔۔۔ اُسے ذرا کیا ہی شخصیت معلوم شفقتی۔۔

مؤثر لگی تھی! —

یہ تو کسی معزز خاندان کے فرد لگتے ہیں! — اس نے ایک مرتبہ چشتی سے کہا تھا۔ سب کے سب پھر دوبارہ جیکل پارک آئے ہوئے تھے! شفقت بھی ساتھ تھے۔ شام کی ڈوبتی ہوئی سُرخی کے پس منظر میں کھڑے وہ اپنے پاکیزہ لباس میں بڑے وجیہہ و شاندار اور خوبرو لگ رہے تھے۔ پھر وہ فرمان کی کسی بات پر بے ساختہ ہنس پڑے اور اُن کے چمکتے دانتوں نے اُن کے تبسم کو جگمگا کر رکھ دیا۔

آپ نے کچھ غور نہیں کیا؟ اچانک فردوس چشتی کے کان میں بولی۔ ان میں تو مجھے کسی جانی پہچانی شخصیت کی شبیہ نظر آرہی ہے! — معلوم نہیں کس کی؟ — وہ شفقت کے چہرے پر نظریں جمائے کسی سوچ میں کھو گئی۔

چشتی نے غور کر کے دیکھا اور آہستہ سے بولے: ٹھیک ہے فردوس۔ مجھے بھی اس چہرے کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں ایسی ہی شباہت کہیں اور بھی دیکھ چکا ہوں۔ یہ یاد نہیں آتا کہ کہاں؟! —

آپ لوگ واپس نہیں چلیں گے؟ — پھر فرمان اور شفقت اُن سب کے پاس آئے اور فردوس اُچھل پڑی۔

سامنے سے دیکھئے تو بجیا جان۔ سائڈ سے ہو بہو ڈیڈی — میرے خدا! پر وہ شفقت کو دیکھ کر احمقوں کی طرح مسکرا دی۔

چلئے چلیں — اب تو میں تھک گئی! —

دن بڑے خوشگوار اور راتیں بے حد سہانی گزر رہی تھیں۔ زیدی صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ عورتوں میں کون سی کھچڑی پک چکی تھی۔ بڑی بیگم اپنے ساتھ بہت سی نسبتوں کی پوری فائل مع تصاویر کے لے آئی تھیں۔ اور موقعہ کی منتظر تھیں۔ انھیں خیال [illegible] بہت جلدی لگی تھی۔ حسن و شباب کی [illegible] سید شفقت [illegible] نازک محبت

اُن کی آمد کو لگ بھگ ڈیڑھ دو ہفتے گزر چکے تھے۔ اور اب حشمی کی رخصت ختم ہو رہی تھی۔ وہ امروز فردا میں واپس جانے والے تھے۔

ایک صبح جب حشمی اور شفقت کسی ادبی نشست میں شرکت کی غرض سے چل دیئے۔ اور لڑکیاں فورٹ کی سیر کے لئے گھر سے نکل گئیں۔ تب بڑی بیگم کو موقع اچھا لگا۔ اتوار کا دن تھا!۔ تقریباً سب اکٹھا تھے!۔

اتفاق سے تذکرہ زیدی صاحب ہی نے چھیڑا۔ "حشمی کا اس قدر جلدی واپس جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ کیا وہ تھوڑے دنوں کی رخصت اور بڑھا نہیں سکتے؟ ...

اب تو شاید وہ رکنا پسند بھی نہ کریں" بڑی بیگم بولیں: "بڑی مشکل سے ... بار بار اصرار کرنے سے رخصت لی تھی۔ ویسے دلہن کا بھی تقاضا تھا کہ جلدی واپس ... کریں گی۔ حشمی بہت مصروف رہتے ہیں!۔"

"بڑا سناٹا ہو جائے گا یکبارگی!" امتیاز صاحب نے کہا: "ان دونوں حضرات کی موجودگی میں بڑا جی لگ گیا۔ غموں کا مارا ہوا ہوں۔ ... ہے۔ خلوص کا تعلق بڑا زبردست ہوتا ہے۔ بھائی صاحب! اب ... کی روانگی کے خیال ہی سے مجھے روح فرسا تکلیف ہو رہی ہے!۔"

"ہاں بھیا! خلوص کا رشتہ خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے!" ... نے کہا۔ "اللہ آپ کے دل کو قرار دے۔ جب مجھ سے شمسہ نے کہا تھا کہ آپ ... بڑے غم سے دوچار ہوئے ہیں۔ تب سے دل کو کوئی مسوسنے لگتا تھا۔ اب ... کہ میری بچی بس چند گھڑی کو ہوتی رہتی ہے۔ مگر جب تک میں اسے روز دیکھ نہ ... کو کسی پل قرار نہیں آتا۔ یہاں ہوں مگر دل اسی میں لگا ہے!۔"

"لڑکیاں چیز ہی یہ ہیں۔ آج ماں باپ کے یہاں۔ کل سسرال میں۔ اللہ میاں نے عجیب قانون رکھا ہے۔ جناب!" بھائی صاحب نے کہا اور ان کی ...

پالے پوسے پروان چڑھائیے، اور ایک ہمارے جگر کے ٹکڑے کا مکمل حقدار کوئی اور بن جائے، لے کر چل دے اپنے گھر۔ جیسے اب ہم سے اور لڑکی سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔

"اب دیکھنا۔ تذکرہ چل نکلا ہے۔ رسیاں تڑا کر بھاگ جائیں گے" بیگم زیدی نے چپکے سے بیگم امتیاز سے کہا۔ انھوں نے برا سا منہ بنا کر زیدی صاحب کو دیکھا۔

"قانونِ قدرت یہی ہے۔" امتیاز صاحب نے کہا: "اگر ایسا نہ ہوتا تو گھر نہ بستے۔ خاندان نہ بڑھتے۔ اولاد نہ ہوتی اور ایک شریفانہ معاشرہ کی جگہ جا بجا گندگیوں کے گٹر کھل جاتے اور دنیا جرائم کا اڈہ بن کر رہ جاتی!"

"علاوہ ازیں۔ یہ مسرت بھی بڑی مسرت ہے کہ ہماری لڑکی ایک گھر کی مالکہ ہے۔ ایک انسان کی رفیقِ حیات، دکھ سکھ کی ساتھی، اس کے بچوں کی ماں، بچہ پرور گھر کی — آنے والی قوم کی معمار ——" بڑے بھائی صاحب نے کہا۔

"اشفاق میاں، بیٹا۔ تم نے بھی کہیں کوئی لڑکا دیکھا ہے۔ اللہ رکھے اپنی صالحہ بی بی کے لئے ——!" دفعتہ بھائی صاحب نے زیدی صاحب سے پوچھ لیا۔

"جی؟ ... جی نہیں ——" وہ بوکھلائے گھبرائے۔ اور جلدی سے بولے۔
"ابھی تو اس نیت سے کسی کو نہیں دیکھا ——!"

"نہیں دیکھا؟" بے حد حیرت سے بھائی نے پوچھا۔

"جی —— وہ تو چھوٹی ہی ہے ابھی ——" زیدی صاحب نے کہا: "مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ [illegible] کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے اُسے گھر بٹھا دوں، بچہ باورچی خانہ میں بھیج دوں۔۔"

[illegible] وقت [illegible] آگئی [illegible] بڑی بیگم نے کہا: ماشاء اللہ [illegible]
[illegible] وقت آگئے تو سعید

بالوں میں افشاں چھڑک کے اور جھریوں دار چہرے پر غازہ لیپ کر اُسے دلہن بنادیجیے
استغفراللہ! — بھائی صاحب نے کہا "نہایت مہمل بات ہے۔ زبیدہ!
بھئی تم نے وہ رسم نامے اور تصویریں اشفاق میاں کو دکھائی بھی ہیں کہ نہیں۔ عجیب
عورت ہو۔ یعنی جس غرض سے آئی تھیں وہی فراموش کر بیٹھیں!"

ارے وہ دفتر کا دفتر اب میں کیا ان کے آگے کھول کر بیٹھتی! — وہ بولیں "
میں نے ان کی بیوی سے کہا ہے کہ دلہن کا بڑا بھائی ہر لحاظ سے موزوں ہے۔ آنکھ
بند کر کے قبول کریں۔ پڑھا لکھا۔ اگلے سال ولایت جا رہا ہے!"

قانون پڑھ رہے ہیں۔ نہایت ہونہار اور قابل ہیں۔ تم نے فردوس کو دیکھا
ہے۔ وہ اس سے بھی اچھے ہیں!" — بھائی صاحب نے تائید کی "میں نے جب
ان سے کہا کہ میاں میں تمہیں ایک مقصد کے لیے حیدرآباد لے جانا چاہتا ہوں تو
تم یقین کرو کہ وہ فوراً تیار ہو گئے۔ ایسا لائق بچہ نہیں دیکھا!"

صالحہ راج کرے گی۔ اور اس کے علاوہ ہم سب بھی قریب رہیں گے"
بھاوج صاحبہ نے کہا "اس کے علاوہ گھر کا گھر ایک ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ
وہ صالحہ کو ہاتھوں چھاؤں رکھیں گے۔ اشفاق میاں۔ تم بس ایک مرتبہ ہاں کر دو۔
باقی ساری ذمہ داری ہماری"

تو نوبت آ ہی گئی جس سے میں ڈر رہا تھا۔ رفیق صاحب نے سوچا۔ ایک
نظر بیوی پہ ڈالی۔ جو نہایت ہی اشتیاق سے آنکھیں اپنے بھائی کو دیکھ رہی
تھیں اور سراپا گوش تھیں۔

"تمہاری کیا رائے ہے۔ اشفاق — ؟" رفیق صاحب نے پوچھا "ہاں بھائی یہ رشتہ
ماشاء اللہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جب بھائی صاحب اور بھاوج صاحبہ ذمہ داری لے رہے
ہیں تو پھر تو ہم کسی ہراس اور بے اطمینانی کی ضرورت نہیں!"

"امتیاز میاں ۔ ذمہ داری کی کیا بات ہے؟" بڑے بھائی نے کہا: "کیا وہ
میری بچی نہیں ہے۔ ذمہ داری تو میں جب لیتا جب دیکھتا کہ وہ غیر کی لڑکی ہے۔"
"بے شک بے شک ۔" امتیاز صاحب نے بڑی عقیدت سے کہا: "واللہ میں
سچ کہتا ہوں۔ اگر آج میری بچی زندہ ہوتی تو میں اس کا ہاتھ بھی آپ ہی کے ہاتھ میں
تھما دیتا۔ خدا کی قسم، آپ کی ذات سے ایسی محبت ہو گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ
سے میرا خون کا رشتہ ہے!"
"میاں، یہی رشتے مستحکم ہو کر خون کے ناطے میں بدل جاتے ہیں۔" انھوں نے متاثر
ہو کر کہا۔
"اشفاق میاں ۔ تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟" بھابی نے پوچھا۔
"کیا جواب دیں گے؟ ۔ انھیں راضی ہی سمجھیے ۔" بیگم امتیاز نے لقمہ دیا۔
"ویسے اور بھی نسبتیں ہیں ۔ تم چاہو تو دیکھ سکتے ہو۔ مگر چونکہ یہ معاملہ اپنا تھا۔ لہذا
میں پُر زور سفارش کر رہا ہوں۔" بھائی صاحب نے کہا۔
"بھائی صاحب اگر ہم بھی لڑکے کو دیکھنا چاہیں؟" کچھ دیر بعد بیگم زیدی نے پوچھا۔
"کیا تم بھول گئے کہ وہ اب بھی ہمارے ساتھ چلنے پر رضامند تھے۔" انھوں نے کہا: "تم جب
کہو ۔ میں بھجوا دوں ۔ نہایت باادب تمیزدار اور سعادت مند لڑکا ہے۔ میرا کوئی
کہنا نہیں ٹالے گا!"
"ایک بات طے ہو جائے تو پھر چاہے ہی لڑکے کو بھیج دوں۔" بڑی بیگم بولیں
"یہ تصویر تو میں ساتھ ہی لائی ہوں۔۔ ؟" یہ کہہ کر انھوں نے پاندان کھولا اور بڑا سا لفافہ
نکالا۔ پھر ایک تصویر زیدی صاحب کو تھما دی۔ واقعی بہت وجیہہ و شاندار آدمی تھا۔ پل بھر
کے لیے تو زیدی صاحب بھی متاثر ہو گئے۔
پھر دفعتاً ان کے ذہن پر سالے کا چہرہ ابھرا۔ اس وقت نہایت آزادی سے خوش رنگ

تتلی کی طرح آزاد فضاؤں میں اڑتی پھر رہی ہے۔ ہنس رہی ہے۔ ہر غم و فکر سے آزاد ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ اس کی عدم موجودگی میں کیسے کیسے بھیانک فیصلے اس کی تقدیر کے ہو رہے ہیں۔ اگر میرے لبوں سے اثبات میں جواب نکل گیا تو وہ پتھر کی لکیر ہو جائے گا پھر دنیا کی کوئی طاقت میرے اثبات کو نفی سے نہ بدل سکے گی۔ میں خود صالحہ کے پیروں میں زنجیریں پہنانے کا گناہ گار ہوں گا۔ اس کی آزادی کا سلب کروں گا۔ اس کے پر نوچ کر قفس میں بند کر دوں گا۔ وہ زبانِ حال سے احتجاج کرے گی۔ اس کے خواب بے تعبیر رہ جائیں گے۔ وہ سوچے گی کہ یہ سب کچھ اس کے باپ نے کیا۔ معلوم نہیں کہ پھر کتنی نفرت اسے مجھ سے ہو جائے گی۔

اس کے بعد ان کے تخیل نے اور زیادہ ہولناک مناظر کا در کھولا۔ صورتیں دھوکا دیتی ہیں۔ کون جانے اس خوبصورت نوجوان کی سیرت بھی خوبصورت ہے کہ نہیں۔ وہ صالحہ پر ستم ڈھائے۔ اس کے آنسوؤں کا سبب بنے۔ ! اور اگر یہ نہیں تو — انھوں نے نہایت شرم و حیا سے سوچا۔

صالحہ کے بچے ہوں گے۔ کوئی بھی تخلیق بغیر کرب و اذیت کے وجود میں نہیں آتی۔ صالحہ پر بھی یہی ایک وقت آئے گا — ہائے — خدا کی پناہ۔ تصویر بے خبری میں ان کی انگلیوں سے پھسل کر زمین پر گر گئی۔ وہ چونک پڑے۔

"بھائی صاحب —" وہ خواہ مخواہ گنہگار سے "بے شک صاحبزادے ہر لحاظ سے اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔ اگر میرا منشا صالحہ کی شادی کرنا ہوتا تو میں انھی کو پسند کرتا مگر —"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم — ہائے" بھابی کی حیرت — "خدا کی پناہ" "ارے کیا تمہارا یہ ارادہ بھی ہے کہ تم خدا نہ کرے بیٹی کو نہ بیاہو گے ؟!"

"جی نہیں — ابھی نہیں — یہ ناممکن ہے!" وہ بڑبڑائے۔

"نہ معلوم یہ آپ کی ہوتا ہے۔ بھابی جان — میری ناہمی کے پھوٹے نصیب !" بیگم زیدی

کو دورا ہی رونما آگیا۔

"تم نہایت غلط سوچتے ہو۔ اشفاق؟" بھائی صاحب کو بھی غصہ آگیا۔ انہیں کے آنسوؤں نے آگ پر تیل کا کام کیا تھا۔ "جب میں پوری طرح ذمہ داری لے رہا ہوں تو پھر کیا امر مانع ہے؟"

"آپ سب مل کر اس کی آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں۔" زیدی صاحب نے کہا "میں شمسہ کو نہیں کہتا۔ ان کا دماغ تو شروع سے خراب ہے۔ خود بھی جاہل ہیں اور اپنی اولاد کو بھی جاہل ہی رکھنا پسند کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک لڑکی کی خوش نصیبی کی معراج بس یہی ہے کہ وہ شوہر کی وفا شعار اور خدمت گزار ہو اور زیادہ سے زیادہ بچے دے۔ لاحول ولا قوۃ!" یہ کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔

"تو پھر عورت کی شرافت اور وفاداری کا معیار آپ کے نزدیک کیا ہے؟" بیگم امتیاز نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے!" زیدی صاحب بولے۔

"زمانہ چاہے کتنا بھی آگے نکل جائے۔ ہر شریف عورت کی شرافت کا معیار ہمیشہ یہی رہے گا جو تم نے عورت کا عیب کہہ کر پیش کیا ہے۔ اشفاق! ڈگری کا حصول مرد کے لئے روزی کا وسیلہ ہو تو ہو عورت کے لئے ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ڈگریوں نے تو جہاں نے آج کل کی عورت کے سامنے مسائل کے لاتعداد پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں وہ بڑی بڑی ڈگریاں حاصل تو کر لیتی ہے۔ مگر اس کا صحیح مصرف نہیں جانتیں۔ یہی ڈگریاں مستقبل کی راہ میں بھی روڑے اٹکاتی ہیں۔ وہ بہرحال، تنہا جانا شروع کر دیتی ہیں۔ جہاں کسی نے کسی کا ہاتھ تھاما ان کے لئے بے حد لازمی اور ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شرع دین متین نے ہر مسلمان عورت مرد کو اطاعت کی تاکید کی ہے۔ تم تو مسلمان ہو کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ ایک باپ کے لئے اسلام

نے جس قدر لڑکی کو نکاح کر کے ایک حج اکبر کا ثواب کمانے کی تاکید کی ہے۔
اُس قدر لڑکی کے ریسرچ اسکالر ہونے کی تنبیہ نہیں کی ۔۔۔!"

"کچھ نہیں ۔۔۔ انگریزی پڑھ پڑھ کے نیچری ہو گئے ہیں! ۔۔۔" سخت غصے
میں بھائی صاحب نے کہا ۔۔۔" میں ایک نہ سنوں گی۔ صالحہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔
اللہ کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ ایسی دھوم سے اس کی شادی کروں گی کہ تمہاری
بھی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی! ۔۔۔"

"مجھے آپ کی محبت میں کوئی شبہ نہیں! ۔۔۔" زیدی صاحب نے گہری نگاہوں سے اپنی
بیوی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر میں نہیں چاہتا کہ ابھی صالحہ کی شادی کا تذکرہ ہو
میں کئی سال تک اس کی شادی نہیں کروں گا ۔۔۔"

"تم پچھتاؤ گے ۔۔۔" بھائی صاحب کی زبان سے نکلا "اب کا سا زمانہ تین چار
سال بعد نہیں رہے گا۔ جو لڑکے اس وقت صالحہ کے قابل ہیں وہ سب بیاہے
جا چکے ہوں گے۔ چند سال بعد صالحہ کی عمر انشاء اللہ پچیس برس کی ہو جائے گی
اور اس وقت اس کے ہم رتبہ لڑکے کو تلاش کرنا ایک مسئلہ بن جائے گا! ۔۔۔"

"کہیں تمہارا منشا اس انکار سے یہ تو نہیں ہے کہ تم اس لڑکے کے ہاتھ میں
لڑکی کا ہاتھ دے دو جسے تم نے گھورے کچرے پر سے اٹھا کر پالا پوسا ہے! ۔۔۔" بھابی
جان نے بڑے دھار دار لہجے میں کہا "جس کے مذہب، ماں باپ اور ذات
پات کا کچھ پتہ نہیں! ۔۔۔ ان صاحبزادے کو دیکھ دیکھ کر میرا تو خون سوکھا جا رہا ہے
صورت شکل میں وہ خاندان بھر کے لوگوں سے بازی لے گئے ہیں۔ ٹھاٹ باٹ
میں بھی کسی سے کم نہیں۔ لیکن تم لوگ کان کھول کر سن لو۔ اگر کہیں اسی بے ننگ و نام
کو داماد بنانا ہے تو ہمارے تمہارے ناطے بس آج ہی سے ختم۔ قیامت تک کیلئے!"

زیدی صاحب کے چہرے پر غیظ و غضب کی پرچھائیاں کانپ کر منجمد ہو گئیں،

وہ کچھ نہ بول سکے۔ البتہ بیگم زیدی نے تملا کر اتنا کہا۔

"ایسا بھی کیا اندھیر ہے" اور خاموش ہو گئیں۔

"ہمارا اطمینان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب تم کم از کم اسی لڑکے کی کہیں شادی کر دو" بھابی صاحبہ نے پھر آگ اگلی "ورنہ ساری عمر دھڑکا لگا رہے گا"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ میں یہی کروں گا" زیدی صاحب بڑبڑائے اور اٹھ کر چلے گئے۔ شمسہ بیگم کا خون کھول رہا تھا۔ یہ کیسے پتھر دل ہیں کوئی دلیل کوئی خوف اور مستقبل کا کوئی اندیشہ انھیں پگھلا نہیں سکتا۔ ان کے دل میں بد دعاؤں کے لاوے کھولنے لگے۔

"ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔" شمسہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں "معلوم نہیں کہ یہ بچی کیسا مقدر لے کر آئی ہے۔ میں تو مر جاؤں گی بھابی جان۔ یہ غم جان لے لے گا۔ میں کیا کروں؟"

"عجیب ماننی اور ہٹ دھرم شخص واقع ہوا ہے؟" بھائی صاحب کو غصہ تھا وہ اقبال صاحب کی طرف مڑ کر بولے "آپ بھی اپنے بدنام دوست کو نہیں سمجھاتے!"

"میں تو ہار گیا بھائی صاحب!" وہ مردہ آواز میں بولے۔

بھابی جان ناقابل فہم خود کلامی میں مصروف تھیں۔ اور زہرہ بیگم روتی ہوئی بیگم زیدی کو منانے میں لگی تھیں۔

ہزاروں باتیں ان میں ہو گئیں مگر بے سود۔ زیدی صاحب کے منہ کے سامنے کون ایسا تھا جو غیر ارادی طور پر اپنی مرضی چلا سکتا۔ بیگم زیدی کی حالت تباہ تھی۔

زیدی صاحب لباس بدل کر نکلے اور اپنے ملازم سے چیخ کر بولے "ٹیکسی لے آؤ"

[illegible] کے لئے جا رہا ہوں۔ گھر سے اور [illegible]

رکھتے ہوئے چلے گئے۔

بھائی صاحب کو صدمہ تھا۔ مغموم آواز میں بولے: "شمسہ انھیں پکار لو۔ ہم سے خفا ہو کر وہ گھر چھوڑ رہے ہیں۔ خدا بہتر گواہ ہے کہ میں ان کی بہتری چاہتا ہوں۔ خیر اپنے بچوں کا مستقبل باپ ہی بہتر سنوار سکتا ہے۔ زبیدہ! تم سامان درست کرو ۔ میں حشمی کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔ اب یہاں فرید قیام ناممکن ہے! ۔"

"بھائی صاحب، مجھ سے خفا نہ ہو جائیے۔ میں تو خود بھی مجبور ہوں!" بیگم زیدی کا یہ حال تھا جیسے آنکھوں سے گنگا جمنا رواں تھیں۔

زیدی صاحب چلے گئے تھے۔ گھر پر سوگ طاری تھا۔ زبیدہ بیگم اب کسی صورت یہاں رہنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ وہ تو بڑی خود اعتمادی سے آئی تھیں اُن کی بڑی توہین ہوئی تھی۔ ہزار زہرہ بیگم اور شمسہ بیگم نے سمجھایا مگر وہ رہنے پر آمادہ نہیں ہوئیں۔

"کاہے کی موئی منھ دکھی محبت؟" وہ بولیں: "ارے وہ تو اپنے برتاؤ سے کہہ گئے کہ ہم اپنا منھ کالا کریں۔ میں تو اب ایک منٹ نہ رکوں گی! ۔"

اور وہ سچ مچ نہ رکیں۔

جب صالحہ واپس آئی تو وہ اُسے گلے لگا کر خوب روئیں۔ سارا حال معلوم کر کے صالحہ کو بے حد صدمہ ہوا۔ یہ فساد اُسی کی ذات سے تو اٹھا تھا۔ وہ نادم و شرمندہ بھی تھی، رنجیدہ اور دلگرفتہ بھی۔

"تیرے باپ نے تجھے قتل کر ڈالا میری بچی! ۔" بھائی صاحب نے بھی کہا۔ "معلوم نہیں زندگی کی مسرتوں میں تیرا حصہ بھی ہے کہ تو صرف ذکر یاں ہی سمیٹے گی! ۔"

"رفت گل بیزار بدیدیم و بہار آخر شد!!" حشمی نے رنج و غم میں کھلی ہنسی

ہنس کر کہا: "اچھا صالحہ۔ جاتے ہیں۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔"

"چشتی بھیا آپ بھی مجھ سے خفا ہو کر جا رہے ہیں!" صالحہ رو پڑی تھی۔

"نہیں صالحہ۔ ہرگز نہیں۔" انھوں نے گرمجوشی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے۔ "دراصل: وہ جیسے تم سب کے دل کی دھڑکنیں سنتا ہوں ... تمہارے دل بھی پڑھتا ہوں۔ مگر مجھے خود اپنے دل کے درد کی دوا نہیں معلوم۔ بڑا احمق ہوں میں۔"

دونوں رشیدہ بھی: "ہائے اب تم کب آؤ گی ہمارے پاس۔۔!"

"اللہ جانے۔ بھائی۔!" صالحہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

اور پھر دو تین دن کی قیامت خیز شورشوں کے بعد گھر بھر میں اختتام سناٹا چھا گیا۔ گویا دیوانی تھی کہ دم گھٹا جاتا تھا! صالحہ پر ایسی ندامت طاری تھی کہ وہ اپنے کمرے میں مقید ہو کر رہ گئی۔

بیگم زیدی کو ایسا شاک لگا تھا کہ وہ بیمار ہو کر رہ گئیں۔ یا تو رو رو کر بیٹیاں اپنے مرنے کی دعائیں مانگتیں۔ زندگی سے ساری دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں۔ زیدی صاحب دوسرے ہی دن واپس آگئے تھے مگر انھوں نے کسی کی واپسی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ نہ بدل کر رہ گئے تھے بلکہ وہ تو بے حد خوش تھے۔ کسی زیادہ چپقلش کے بغیر ان کی مرضی پوری ہو گئی۔

عائشہ باپ سے خفا تھی۔ تقریباً ہر سمجھدار انسان کے لئے زیدی صاحب کی روش نہایت ناپسندیدہ اور نامناسب تھی! جب بیگم زیدی بیچ پڑتے بیمار پڑ گئیں تب عائشہ کو باپ سے ایک گونہ نفرت ہو گئی

"باجی۔۔" وہ نہایت ناخوشگوار لہجے میں صالحہ سے بولی "کیا آپ کے بعد کے علاوہ باباجان اور کتنوں کو بھی اپنی گردن پر لیں گے!!۔۔"

لڑکی۔ ایسی سنجیدہ باتیں بھی کر سکتی ہے۔ جو وہ چپ بھی تو نہیں کر سکتی۔

عائشہ بک بک کر خاموش ہو گئی تو صالحہ نے سوچا وہ غلط نہیں کہتی۔ مگر وہ غیور اور حیادار اتنی تھی کہ اس کے لبوں سے ایک حرف نہیں نکل سکا کہ وہ کیا چاہتی تھی۔

زیدی صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا۔

"کوئی کم بخت نہیں جانتا کہ میں نے اپنی بچی کو کیسی نزاکت سے پروان چڑھایا ہے۔ بھلا میرا ہیرا کسی پتھر سے کچلا جائے۔ ناممکن ـــ؟"

صالحہ دل ہی دل میں گریہ آلود ہنسی ہنس پڑی۔

بابا جان۔ ہیرا جب تک کسی بادشاہ کے تاج میں نہ جڑا جائے۔ اس کی قدر و قیمت ہی کیا ہے؟۔ کون دیکھے گا ہیرے کی آب و تاب؟ ـــ

بیگم زیدی کو خیال تھا کہ زیدی صاحب اُن سے اپنے سلوک کی معذرت چاہیں گے مگر جب وہ پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آئے تو ان کا دل بہت دُکھا۔ وہ تو بیمار ہی تھیں۔ زیدی صاحب سمجھے کہ انھیں متاثر کرنا چاہتی ہیں مگر جب وہ سچ مچ زیادہ علیل ہو گئیں تو انھیں بھی تشویش ہوئی۔

عائشہ سے پوچھا تو اس نے بے رخی سے جواب دیا "بیمار کیوں نہ ہوں بابا جان" زیدی صاحب جو بڑے قابل شخص تھے۔ جانے نہیں کیا کچھ پڑھے بیٹھے تھے۔ مگر عائشہ کے اس چھوٹے سے فقرے کا مفہوم نہ سمجھ سکے! پھر انھوں نے صالحہ سے دریافت کیا۔

صالحہ نے اپنی فطری شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر کہا "وہ ماموں جان کی جدائی سے متاثر ہیں۔ ابا جان۔ ان کا خیال ہے کہ وہ بگڑ کر چلے گئے ہیں اور اپنے خاندان سے کوئی ربط نہیں رکھیں گے!"

"دیکھیں۔ اس میں ہمارا کیا نقصان ہے!" زیدی صاحب نے کہا "بھئی یہ عجیب زبردستی ہے۔ کسی پر جبراً اپنی مرضی لادی جائے۔ اگر وہ نہ مانے تو ڈرایا دھمکایا

جائے۔ رشتے ناطے منقطع کر دئیے جائیں۔۔۔ یا یہ کیا معمہ ہے؟۔

اُن کی ہمت نہیں تھی کہ وہ بیوی کے سامنے جائیں مگر پُرسش تو ضروری تھی! ایک شام ڈرتے ڈرتے ان کے کمرے میں پہونچے۔ عائشہ کھڑی عرق نکال رہی تھی وہ گلاس اور پھل وغیرہ سمیٹ کر کمرے سے چلی گئی۔

بیگم زبیدہ کی خاموش اور اُداس اپنے پلنگ پر اور پُرشکن بستر پر پڑی تھیں۔ پیشانی پر رومال بندھا تھا!۔۔۔ چہرہ زرد۔ آنکھوں سے تکلیف مترشح تھی!۔۔۔

کیسی طبیعت ہے۔ بیگم؟۔۔۔ زیدی صاحب ان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اور ڈال پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھا۔ اور یہ محسوس کر کے خائف ہو گئے کہ انہیں بخار زیادہ آ گیا تھا۔ اُن کی پُرسش کے جواب میں وہ کچھ نہ بولیں۔

اتنی جلدی تم ایک معمولی بات کا اثر لیتی ہو کہ بس میں کچھ کہہ نہیں سکتا: وہ پھر دلدہی کے لہجے میں بولے: مجھے کچھ غصہ آ گیا۔ ورنہ یہ کون حماقت زدہ سوچ سکتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی حق تلفی کرے گا۔ اس کا صبر سمیٹے گا۔ اگر وہ سرے میرے بچوں کے خیر خواہ ہیں تو کیا میں خیر خواہ نہیں ہوں۔ میں جو انہیں ہر طرح سجا رہا ہوں سنوار رہا ہوں انہیں ہر طرح مکمل دیکھنا چاہتا ہوں تو کیا اس لئے کہ کسی اندھیرے غار میں انہیں دھکا دے دوں۔ عقل سے سوچو بیگم۔ جب میری لڑکیاں نہایت درجے مکمل ہو جائیں گی تو ان کے لئے نہایت اعلیٰ ترین خاندانوں کے رشتے آئیں گے۔ انشاء اللہ میں ان کی شادیاں دھوم دھام سے کروں گا۔ اب یہ جو تمہارے بھائی صاحب لائے تھے وہ بھی کچھ یونہی سا تھا۔ لڑکا تو کچھ معمولی ولایت جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ صالحہ کو بھی لے جاتا۔ معلوم نہیں کہ پھر وہ کب واپس آتا اور کب تم اپنی لاڈلی لڑکی کو دیکھ سکتیں۔ پتہ نہیں کہ کتنی مدت کی جدائی تم پر ہو جاتی۔ یہی سب کچھ میں کہتا ہوں تو کوئی سمجھتا نہیں۔ دشمن سمجھتے ہیں مجھے اپنی لڑکیوں کے حق میں۔ اوروں کا کیا تذکرہ۔ تم خود بھی سمجھتی ہو؟!۔۔۔

ڈگمگا رہا تھا۔ کیا اب سارا گھر ہی تلپٹ ہو کر رہ جائے گا؟ ـــ

کھانے کے بعد دیر تک شفقت نے اس کا انتظار کیا۔ جب وہ نہیں آئی تو خود اسے آواز دی۔ وہ ان دنوں بڑے خوش رہتے تھے کہ اپنی شب و روز کی خدمت سے سب کے دل جیت لئے تھے۔

"میں آپ سے اب نہیں پڑھوں گی۔ شفو بھیا! ـــ" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"کیوں کیا تم بی۔ اے۔ ڈی ہو چکیں؟" انھوں نے پوچھا۔

"امی نے منع کر دیا ہے۔ کہ ہم آپ کے سامنے نہ نکلیں ـــ"

"نہیں......!" وہ متحیر رہ گئے۔

عائشہ ماں کے خوف سے بھاگ آئی اور نیم تاریک برآمدے میں کھڑے شفقت سوچتے رہے کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ ـــ کیا خدمت رائیگاں گئی۔ عائشہ اٹھارہ سال کی معصوم لڑکی۔ جسے وہ چھوٹی بہن کی طرح چاہتے تھے جو انہی کی گود میں کھیل کود کر بڑی ہوئی ہے۔ کیا اب وہ ان سے پردہ کرے گی! ـــ

اس رات انھیں نیند نہیں آئی۔ اور پھر وہ سب سے دور دور رہنے لگے! ـــ

گھر کی حالت عجیب تھی! ـــ جیسے ہر فرد اعصابی کشیدگی میں مبتلا تھا۔

ایک شام بیگم امتیاز نے عائشہ کو خوشخبری سنائی کہ کل فرحان کی سالگرہ ہے۔

"کیوں ... مجھ سے نہیں کہا امی! ـــ" عائشہ بولی۔

"نہیں پتہ تھا بیٹی ـــ مگر یہ تو تمہاری خوشی تھی۔ میری خوشیاں بہت محدود ہو گئی ہیں۔"

عائشہ نے گھر بھر میں سب کو اطلاع دی۔ اور دوسری صبح (؟) سے سہیلیاں کوٹھی بھی آ گئیں۔ رات ... بہار سجے تھے۔ عائشہ کی نظریں فرحان کو تلاش کر رہی تھیں۔ ملازمہ نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں بند ہے۔

عائشہ نے [illegible] کافی بجے۔ اور [illegible] ادا۔ اور

پلستر بھر کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

سامنے اپنی مسہری پر فرمان منھ چھپائے پڑا تھا۔ اس کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

"فرمان؟ —" عائشہ نے اس کے سرہانے بیٹھ کر اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں الجھا دیں "تم رو رہے ہو۔ فرمان؟ — اتنے ناسمجھ ہو گئے ہو —" وہ چپ چاپ روتا رہا۔

اس کی آواز بھرا گئی — "خدا کے لئے مجھ سے کہو۔ تم کیوں رو رہے ہو۔ تمھیں ممی کا خیال بھی نہیں رہا۔ وہ کیا سوچیں گی۔ اب تم ہی تو اُن کی خوشیوں کا واحد مرکز ہو —"

"مجھے امی یاد آ رہی ہیں!! —" اس نے چہرہ اٹھایا۔ آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ — "پچھلے سال امی زندہ تھیں۔ وہ کتنی خوش تھیں۔ انھوں نے گھر سجایا تھا۔ مجھے سنوارا تھا۔ مجھے لپٹا کر خوب پیار کئے تھے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ بس ان کی زندگی اک ساعتِ مختصر کے لئے ہے۔ سال بھر بھی وہ زندہ نہیں رہیں گی؟ — اللہ اللہ آج پھر میری سالگرہ ہے۔ میرے گھر میں روشنی ہے۔ مہمان آ رہے ہیں۔ اور میری امی کفن پہنے قبر کی تاریکیوں میں پڑی ہیں! —" وہ سسک سسک کر رونے لگا۔

عائشہ اس کے ساتھ رونے لگی۔ پھر دیر بعد وہ ہنسی اور فرمان کو سمجھایا، اُس کا منھ ہاتھ دھلا کر اپنے آنچل سے اس کا چہرہ پونچھا۔

دفعتاً فرمان نے اس کی کلائی تھام لی اور بولا۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے سچ سچ بتائیے گا؟؟ —"

"پوچھو —!" وہ زبردستی مسکرائی۔

"اگر ایسا اتفاق ہو جائے کہ میں مر جاؤں تو آپ میرے لئے —؟"

"نہیں فرزان — !" اس نے اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "یوں نہیں تم یوں کہو کہ اگر آپ بھی اسی طرح مر گئیں تو کیا ہوگا — ! —"

"بدلہ نہ لیجئے —" فرزان نے کہا: "معاف کر دیجئے پھر کبھی نہیں کہوں گا۔"

پھر عائشہ نے کافی بنائی اور سارے لوازمات میز پہ سجا دیئے۔ وہ کرسی پر آ بیٹھا۔

"آپ میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ اب تو میں آپ کے بغیر زندگی کا تصور تک نہیں کر سکتا۔"

"اچھا؟ —" وہ ہنسنے لگی۔

"میں اکثر سوچتا ہوں کہ جب آپ کی شادی ہو جائے گی تو پھر میرا کیا حشر ہوگا۔"

"بکو مت —" اس نے ڈانٹ دیا: "نہا دھو کر باہر نکلو۔ وقت کم رہ گیا ہے۔"

"آپ کی سالگرہ کب ہے؟ —" دفعتہً اس نے پوچھا۔

"کبھی نہیں ! —" وہ ہولے سے مسکرائی: "امی کہتی ہیں کہ ہر سال عمر کی ڈور دو میں گرہ لگانا نحوست ہے ! —"

"ٹھیک ہے —" فرزان نے آہستہ سے کہا: "یہ نحوست اور بدشگونی ہے۔ نئی عمر کا آغاز روشنی گل کر کے کیا جائے۔ ایڈیٹ ! —"

"کون؟ —" وہ چونک کر بولی۔

"کوئی نہیں ! —" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا: "آپ کو نہیں کہا۔ پتہ نہیں یہ رسم کس نے ایجاد کی ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ اگر مجھے ممی کی دلشکنی کا خیال نہ ہوتا تو یہ کبھی نہ کرتا...... مگر ابھی آپ سے کبھی تحفہ وصول کرنا ہے۔ یہ معاملہ تو مزدور رہے گی ! —"

"فرزان محمد صاحب —" وہ ہنس کر بولی: "میں آپ کو اچھی دو دیر تک دوں گی۔ کسی اور خیال میں نہ رہئے گا —"

"یہی میں آپ سے چاہتا ہوں —" وہ یک بیک بے پناہ سنجیدہ ہو گیا: "وعدہ!

ہو چکے ہو ۔۔۔!"

"میں پانچوں وقت نمازیں پڑھتا تھا، سجدوں میں اذانیں بھی بڑے شوق سے دیتا تھا، تلاوت کرتا تھا۔ مگر وہ مر گئیں۔ میں نے سوچا کہ خدا بے نیاز اور لاپرواہ ہے۔ اُسے میری نماز، روزہ، تلاوت اور اذانوں سے کوئی مطلب نہیں۔ پھر میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ اب اگر خدا میرا نہیں تو میں خدا کا نہیں!۔۔۔"

اور عائشہ کو احساس ہوا کہ فرحان صرف ایک کھلنڈرا لڑکا نہیں۔ وہ سنجیدہ ترین مرد ہے۔ اس کے خیالات ممتین بھی ہیں اور باغیانہ بھی۔ وہ بلکہ خود کو اس سے چھوٹا محسوس کرنے لگی۔ پھر اس نے سوچا کہ اس سے بحث ہی نہیں کرنی چاہئے۔ اس کے خیالات ٹھیک نہیں کیا فائدہ کہ وہ خود بھی گنہگار رہے۔ اور اس کو بھی گناہ گار کرے۔

سہ پہر تک اس کے یہاں تھوڑے بہت مہمان آ گئے ان کے عزیز یہاں بہت کم تھے۔ امتیاز صاحب نے اپنی بہن کو ٹرنک کال کیا تھا۔ مگر فرحان نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"ڈیڈی۔ وہ۔ پھر وہ اپنی ڈرپوک صاحبزادی کے چلی آئیں گی۔"

ہائیں۔۔۔ بیٹے کیا کہتے ہو۔۔۔؟" امتیاز صاحب حیرت سے بولے۔ "تمہیں صاحبزادی سے کیا واسطہ؟۔۔۔"

آپ انھیں ضرور بلایئے ڈیڈی۔۔۔؟" عائشہ نے کہا۔

سنئے۔۔۔ وہ لڑکی بنتی بہت ہے۔۔۔" فرحان نے کہا۔

• تمھیں اس سے کیا!۔۔۔"

اچھی بات ہے تو پھر بلوا لیجئے۔۔۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔ امتیاز صاحب نے فرحان کی مرضی نہیں دیکھی تو وہ ٹال گئے۔

مغرب کے بعد فرمان لباس بدل کر باہر آیا۔ گہری نیلی شیروانی سنہرے دستار اور سفید پاجامے میں ملبوس وہ بہت اچھا لگ رہا تھا!۔ عائشہ نے بے اختیار اس کے گال اپنے ہاتھوں میں دبا لیے۔

"فرمان تم کتنے خوبصورت ہو!"

"دراصل آپ کی نظریں خوبصورت ہیں!"

وہ محسوس کر رہی تھی کہ فرمان کے دل میں اپنی بہن کی یاد کا لاوا پگھل کر آنسوؤں کی شکل میں بہنے کو تیار تھا مگر وہ بہت ضبط کر رہا تھا!۔

پھر ڈنر سے پہلے اس کی سالگرہ کی رسم ادا ہوئی۔ بہت خاموشی کے ساتھ زیادہ مہمان نہیں تھے۔ اسے تحفے بھی بہت کم مگر بہت قیمتی ملے!۔ اس نے ہار پھول پہننے سے بھی انکار کر دیا۔ اور گم صم ماں کے پہلو میں بیٹھا آہستہ گداز سی مسکراہٹ سے یہ ساری اداس چہل پہل دیکھتا رہا۔

ڈنر کے بعد گھر پھر سونا ہو گیا۔ وہ سب تھکے ہوئے تھے۔ وہیں تختوں پر لیٹ گئے۔ عائشہ صبح سے اب تک مصروف رہی تھی، نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں وہ بھی بیگم امتیاز کے پہلو میں لیٹ گئی۔

رات کے گیارہ بجے فرمان اپنے دوستوں کو رخصت کر کے اندر آیا۔ عائشہ اٹھ بیٹھی۔ فرمان نے شیروانی اتار کر کرسی پر پھینکی اور دستار عائشہ کے سر پر رکھ دی۔ پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"حضور ۔ وہ اچھی دعائیں کہاں ہیں۔ کیا زبان ہلانے میں بھی اب کھاد ہے!"

"وہ تمہارے سر پر رکھ دی ہیں!" عائشہ نیند کی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"دعائیں تو؟!" فرمان نے آنکھیں پھیلائیں۔

پھر اُسے ہوش آیا۔ اپنے تکئے کے نیچے سے اس نے ایک سنہرا کیس نکالا اور اُسے تھما دیا۔ فرمان نے کیس کھولا اور اچھل پڑا۔ بے حد خوبصورت گھڑی سیاہ مخمل میں چمک رہی تھی! ــــ

بہت بہت ــــ!" وہ شکریہ ادا کرنے چلا تھا مگر عائشہ نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

شکریہ غیروں کا ادا کرتے ہیں۔ میں تو تمھاری ہوں!"

سچ سچ!" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

تمھیں کچھ شک تھا!

اگر تھا بھی تو اب دور ہو گیا ــ" اس نے گھڑی اپنی کلائی پر باندھ لی اور چپکے سے بولا۔

"ایک بات کہنے کی ہے۔ اگر آپ مانئے تو ــ وعدہ کیجیے ــ!"

وعدہ کئے بغیر بھی مان لو گی! ــــ

"تو پھر آنکھیں بند کر کے ہاتھ میری طرف پھیلا دیجئے!"

اس نے مسکرا کر آنکھیں بند کرلیں اور ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

فرمان نے اس کا ہاتھ تھام کر ایک انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔

"فرمان ــ یہ کیا!"

"انگوٹھی ہے!ــ" وہ ہنس پڑا۔

"مگر تم نے مجھے کیوں پہنا دی ــ؟"

کیا کیسے پہناتا؟ ــ اچھا اب سو جائیے۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے! شب بخیر!"

اور وہ دور پڑے صوفہ پر جا کر لیٹ گیا۔ اس رات عائشہ کی نیند کافور

اس کی نذر کیا۔ اور پھر وہ سب گھومنے چلے گئے۔

پروفیسر رازی، زیدی صاحب کو دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

"کہیئے۔ کیا کام ہے؟! ۔۔۔" زیدی صاحب نے اس کے سلام کے جواب میں لٹھ سا مار دیا۔ وہ پتہ نہیں کیوں ان دنوں بہت وحشت مزاج اور تند خو ہو گئے تھے۔

رازی کیا کہتا کہ وہ کس کام سے آیا تھا! ۔۔۔۔ ہو سکتا تھا کہ اس کے ہونٹوں سے کام کی نوعیت نکلتی اور ساتھ ہی جسم سے جان بھی نکال دی جاتی! دراصل وہ صائمہ سے ملنے آیا تھا۔ اتنے دن تک اس نے صبر کیا تھا۔ وہ اپنی سادگی اور پاکیزگی میں اُسے بہت پسند آئی تھی! ۔ وہ دل کی تمام تر گہرائیوں سے اُسے چاہنے لگا تھا! ۔ مگر زبان سے محبت کا اقرار کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ رفتہ رفتہ صائمہ سے میل جول بڑھائے گا۔ آہستہ آہستہ اس پر اپنی محبت واضح کرے گا اور پھر آخر میں درخواست پیش کرے گا۔ دل چیر کر دکھائے گا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا!۔

مگر زیدی صاحب کے ڈرائینگ روم میں پہنچ کر اس کے حواس گم ہو گئے۔ وہ تمام گفتگو جو سوال جواب کی شکل میں اس نے دل ہی دل میں رٹ رکھی تھی۔ ذہن سے ہوا کی طرح نکل گئی۔ اور جب ملازم نے اس سے پوچھا کہ وہ کس سے ملنا چاہتا ہے؟ تو بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ پروفیسر صاحب سے!۔

اور اب وہ پروفیسر صاحب کے سامنے ایک مجرم کی طرح بیٹھا تھا۔ جیسے اسے یقین ہو کہ اس کے خیالات ٹیلی پیتھی کے ذریعہ زیدی صاحب پر واضح ہو چکے ہیں!۔

"فرمائیے۔ صاحبزادے۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی؟۔۔"

"جی۔ وہ۔ دراصل میں ریسرچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں!" دل ہی دل میں اپنی بزدلی پر لعنت ملامت کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہاں ہاں ضرور کیجئے ۔ بڑا نیک ارادہ ہے!"

"سپروائزنگ کے لئے جناب کو زحمت دینا ہے!"

"بے شک بے شک ۔" زیدی صاحب نے کہا: "مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں کسی طالب علم میں آگے پڑھنے کا حوصلہ اور ترقی کرنے کی امنگ دیکھتا ہوں۔ آپ سمجھئے میاں کہ علم وہ چیز ہے کہ جس کی کوئی حد ہے نہ انتہا۔!"

"جی ہاں۔ تو پھر میں کب آؤں" ۔ وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا بولا۔

"ہر طالب علم کے لئے میرے غریب خانے کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں!" وہ ہنسے۔ اور ملازم کو بلا کر کافی وغیرہ کا آرڈر دیا۔

"نہیں جناب۔ زحمت نہ کیجئے!"

"زحمت کی کوئی بات نہیں ۔ فرمان کی سالگرہ تھی کل۔ اسی سلسلے میں چھوٹی سی دعوت بچوں نے کی ہے۔ تم بھی چکھو" وہ مسکرائے۔

"اوہو ۔ فرمان کہاں ہیں ۔ میں بھی انہیں مبارک باد دیتا ۔!"

"میں اسے ابھی بھیجتا ہوں ۔" یہ کہہ کر زیدی صاحب کمرے سے چلے گئے۔

پانچ منٹ کے بعد ہی ملازم کافی اور لوازمات لے آیا۔

"فرمان میاں نہیں ہیں صاحب ۔ کہیں باہر گئے ہیں!" ملازم نے کہا۔ اور میز پر سب کچھ سجا کر اس کے حکم کا منتظر کھڑا ہو گیا۔

داؤدی کو اپنی بزدلی اور چھچھورے پن پہ بہت غصّہ آ رہا تھا۔ اس نے جل بھن کر دو ایک نمکین بادام چکھے اور آدھی پیالی کافی پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔

زیدی صاحب اور امتیاز اب لائبریری میں چلے گئے تھے۔ دالان میں کوئی نہ تھا! تب ادھر ادھر دیکھ کر بیگم زیدی نے خط بیگم امتیاز کو دکھا دیا۔

"بھائی جان مجھے جیتے نہ دیں گی۔ کیا جلا کٹا خط لکھا ہے۔ یہ نہیں سوچتیں کہ

ہیں کیسی مجبور ہوں۔ اب تو خدا مجھے اٹھا ہی لے۔"

بیگم امتیاز سے بھی پورا خط پڑھا نہیں گیا۔ خط کیا تھا۔ زہر ہلاہل الفاظ میں بند تھا۔

کون شریف لڑکا ہے جو سنکی اور بد دماغ باپ کی لڑکی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانا پسند کرے گا۔ ہم تو لڑکی کی ہی محبت سے مجبور ہو کر آئے تھے کیا پتہ تھا کہ باپ بیٹی کی کمائی کھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ وقت قریب ہے جب پچھتانا پڑے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ اُس وقت کے آنے سے پہلے اپنی لڑکی کو غلاظت کے اُسی گڑھے میں دھکا دے دو۔ جو تمھارے شوہر نے اسی غرض سے گھر میں تیار کر رکھا ہے۔ ہم نے تو بھر پایا۔ اب دیکھیں گے کون آخر کی بھرتی کو اٹھائے جاتا ہے۔"

فرطِ غم سے بیگم زیدی کے آنسو نکل آئے۔ وہ تو زندہ درگور ہو رہی تھیں۔ انھیں اس کی بالکل توقع نہیں تھی کہ بھائی جان باپ کی زیادتی کا بدلہ ناکردہ کار معصوم لڑکی سے لیں گی۔

"آخر وہ تمھاری دشمن کیوں ہو گئی ہیں؟" زہرہ بیگم نے پوچھا" وہ تو یہاں کا سارا حال دیکھ گئی تھیں۔ تمھاری تو طرفداری اور لڑکی کی ہمدردی کرنی چاہیے تھی!"

بیگم زیدی بلند آواز میں رو پڑیں" یہ تو ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھو مجھے کون کون سے زخم اپنے دل پہ سہنے پڑتے ہیں۔ ہائے جب اپنے ہی بیگانے بن جائیں تو پھر بیگانوں کا کیا شکوہ کیا جائے۔ یہ میں کدن سے جنجال میں پھنسی ہوں میں شروع ہی سے کہتی رہی کہ پرائے بچے کو خواہ مخواہ نہ پالئے۔ اتنے بہت سے یتیم خانے ہیں۔ کسی ایک میں چھوڑ دیتے۔ آخر آئی نا اتنی بڑی بات؟"

"میں کہوں گی اشفاق بھائی سے کہ کم از کم شفقت ہی کی شادی کر دیں۔ اُن

کے بعد یہ تو نہ ہوگا کہ لوگ ایک تکرار بات کو بار بار کہیں!" بیگم امتیاز نے کہا۔

"وہ جلاد ہیں۔ زہرہ۔ وہ مجھے یونہی رلا رلا کر گھلا گھلا کر مار ڈالیں گے لڑکیاں میری میت پر سر پٹیں گی۔ شفقت میرے جنازے کو کندھا دینے کے لئے یہیں ڈٹے رہیں گے۔ تم دیکھ لینا کہ شادی کسی کی بھی نہ ہوگی۔ یہ اٹل ہے!"

زہرہ بیگم نے انھیں بہت سمجھایا۔ وہ رو دئے۔ مگر شمسہ بیگم کا دل ہل گیا تھا۔

دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ معلوم نہیں۔ بھائی جان اس ناپسندیدہ صورت حال کا تذکرہ کس کس سے اور کون سے پیرایہ میں کریں۔ صالحہ کی بدنامی اور رسوائی کا خیال انھیں مارے ڈال رہا تھا!۔ آخر وہ بیزار ہوگئیں۔ سوچتے سوچتے انھیں خیال آیا کہ اب یہ ان ہی کا فرض ہے کہ وہ شفقت کو کسی بہانے اس گھر سے نکال دیں وہ ان کے احسانوں کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ عدول حکمی کی مجال نہیں رکھتے

بیگم امتیاز نے انھیں سمجھا بجھا کر اپنے گھر کی راہ لی۔ بچے باہر تھے۔ بیگم زیدی چپکے سے اٹھ کر شفقت کے کمرے کی طرف آئیں۔ اندر روشنی ہو رہی تھی! شفقت کرسی پر بیٹھے میز پر سر اوندھائے رکھ دیئے۔ انھیں بیگم زیدی کی آمد کی خبر تک نہیں ہوئی۔ وہ خاموشی سے جا کر ان کے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ تب بھی شفقت کو احساس نہیں ہوا۔ پھر دفعتہً خاموشی میں بیگم زیدی کو ان کی سسکیاں سنائی دیں۔ اور یکبارگی ان کا دل دھڑک اٹھا۔ نجانے کون کون سے خیالات آندھی طوفان کی طرح آئے گئے۔ وہ بالکل دبے پاؤں اٹھیں اور کمرے سے نکل آئیں۔ پھر اپنے کمرے میں پہونچ کر ملازم سے کہا کہ وہ شفقت کو بلا لائے۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ آگئے۔ اور دہلیز پر رک کر اندر آنے کی اجازت لی۔

"آؤ۔ بیٹھو!"

شفقت کا دل رگ رگ میں دھڑک رہا تھا۔ یہ انہونی ہے۔ کوئی خاص بات۔ تبھی تو بیگم صاحبہ نے انھیں یاد کیا ہے۔ ورنہ کب وہ اتنی مہربان رہی ہیں!۔۔ وہ چپ چاپ دور پڑی ہوئی کرسی پر ٹک گئے۔ اور دل کو سمجھانے لگے کہ کچھ نامہربان الفاظ سن کر ٹوٹ مت جانا!۔۔۔

بیگم زیدی نے اُن کا غور سے جائزہ لیا۔ سفید لباس میں ملبوس، وجیہہ اور شریف چہرہ۔ بلند و بالا قد و قامت۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ زیدی صاحب کا اپنا بیٹا نہیں ہے۔ کہنے والے اگر صائمہ سے منسوب کر کے کہیں تب بھی جائز ہے۔ جس گھر میں ایک اجنبی جوان مرد اور دو نوجوان لڑکیاں ہوں۔ وہ گھر تو بے شک لوگوں کی دلچسپی کا باعث بن جائے گا!۔۔۔

"شفقت میاں۔۔۔؟" بالآخر انھوں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا: "ابھی تمھاری پڑھائی میں اور کتنے دن باقی ہیں؟۔۔"

"دو ڈھائی مہینے باقی ہیں۔۔" شفقت نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔

"شفقت۔ اس گھر میں تم ہمارے بچے کی طرح رہے ہو۔" انھوں نے کہا "کوئی کوتاہی تمھاری پرورش میں نہیں کی۔ میاں۔ کیا یہ تمھارا فرض نہیں ہے کہ تم اُن کی بھی خدمت کرو۔۔۔!"

"خدمت بہت چھوٹی سی چیز ہے۔ امی۔ اگر بابا جان مجھ سے میری زندگی بھی مانگیں تو میں سمجھوں گا کہ انھوں نے مجھ سے حقِ رشتے کا مطالبہ کیا ہے!۔۔۔" شفقت نے کہا۔ اور دبی ہوئی آہ بھر کر کہا۔ "فرمایئے امی۔ کون سی خدمت مجھے انجام دینی ہے!

تمھاری سعادت مندی سے مجھے یہی توقع تھی!" انھوں نے کہا: "بیٹا۔ تم ہم سب کے خیر خواہ ہو۔ کیا تمھیں یہ گوارہ ہو سکتا ہے کہ لوگ تمھاری بہنوں پر انگلیاں اٹھائیں۔

"آہ! — امی۔ کیا یہ میری ہی بدبختی اور شامت ہے کہ آپ نے صالحہ اور عائشہ
کو میرے سامنے آنے سے روک دیا ہے۔" یک بیک اُن کی آنکھوں میں آنسو
چھلک آئے۔ "کس نے آپ کے خیالات خراب کر دیے ہیں۔ کیا آپ مجھے اس درجہ
ذلیل اور احسان فراموش سمجھتی ہیں۔ امی۔ میں نے تو عائشہ کو اپنی گود میں کھلایا؟
کیا مجھ بدنصیب کی نیت اتنی ہی خراب ہو گئی ہے۔!"

"نہیں شفقت تم رو نہیں! —" بیگم زیدی نے خفیف ہو کر کہا: "میرا منشا یہ نہیں
تھا! — بیٹا۔ تم زمانے کی اونچ نیچ سے واقف نہیں ہو۔ یہاں لوگ پر کو کوا بناتے
ہیں۔ تم جانتے ہو کہ لڑکیوں کی عزت آبرو موتی کی آب ہے کہ خدانخواستہ گئی تو
گئی۔ یہاں لوگ خون کے رشتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے! —"

"کس نے آپ سے کیا کہا ہے امی.....؟" فرطِ جذبات سے وہ تڑپنے لگے۔
"کہا کسی نے نہیں۔ مگر خیال تو مجھے رکھنا پڑتا ہے۔" انھوں نے جواب دیا: "بیٹا
تم ہم سب کے بہی خواہ ہو۔ تم لوگوں کے منہ بند کر سکتے ہو۔۔۔!"

"ہمسایوں کے منہ بند کر سکتا ہوں۔ اس طرح کہ — پھر اُن بدنہادوں کا منہ کھینچ
لوں گا تو وہ دوزخ کے سامنے حساب بھی دیتے وقت کھلے گا! — کیا میں گوارا کر سکتا ہوں کہ
میری وجہ سے ان پر حرف آئے جن کا میں نمک کھا رہا ہوں ——"

بیگم زیدی نے دیکھا کہ اُن کا چہرہ فرطِ غضب سے سنولا رہا تھا۔ یہ وہ شفقت
نہیں تھے کم گو۔ خاموشی پسند اور مجبور — یہ دوسرے شفقت تھے۔ نڈر، پُرغضب
خود مختار —— وہ پل بھر کے لئے ڈر گئیں کہیں الٹی آنتیں گلے نہ پڑیں۔

"بتائیے — امی۔ کون ہیں وہ لوگ۔ جنھوں نے مجھ پر یا صالحہ، عائشہ پر کوئی الزام
رکھا ہے۔ خدائے ذوالجلال کی قسم۔ میں اُن کا خون پی لوں گا —!"

"بیکار خفا ہو رہے ہو شفقت! — کون لوگ ہیں۔ کہاں ہیں۔ جن پر تم خون

پڑ لوگے۔ یہ تو میں نے ایک خیال ظاہر کیا تھا کہ لوگوں کے منھ پر خدا نے تالا نہیں لگایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل کلاں کو کوئی بدنہاد ایسی رکیک جاہلانہ بات منھ سے نکال دے۔ اس سے پہلے کہ کسی سے جوابدہی کرنی پڑے۔ کیوں نہ میں ایسا انتظام کروں کہ اس کا امکان ہی نہ رہے"

شفقت نے ایک طویل آہ بھر کر سوچا۔ "تو آپ کی مہربانی ہے۔ اور یوں بے بس ہو کر بیٹھ گئے جیسے بدن میں جان ہی نہ رہی ہو۔

"تم کہوگے شفقت کہ میں نے اب تک تمہارے لئے کیا کیا ہے۔ جو میں تمہیں اپنی کسی بات مجبور کروں۔ اگر میں تمہاری حقیقی ماں ۔۔۔۔ !"

آپ نے نہ سوچا ہو۔ امی۔ مگر خدا بہتر گواہ ہے کہ میں ہمیشہ آپ کو اپنی ماں ہی کے برابر سمجھتا رہا ہوں۔ مجھ بدنصیب کو تو یہ بھی نہیں معلوم کون میرا باپ تھا۔ کون ماں تھی جنھوں نے مجھے پیدا کر کے ایک احسان عظیم مجھ پر کر دیا ہے" یہ کہتے کہتے اُن کی آواز بھرا گئی "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کہاں جاؤں۔ کیا کروں۔ میں ایک اچھوت کی بھی پوزیشن اس کی برادری میں ہوتی ہے۔ میں تو اس سے بھی گیا گزرا ہوں !۔۔"

جب تک ایسی باتیں سوچو گے۔ دل کڑھا کرے گا۔" بیگم زیدی نے اُن کا سر سہلاتے ہوئے محبت سے سمجھایا "میری مانو شفو۔ اب تم شادی کرو۔ گھبراؤ وہ تمام طوفان جن کے اُٹھنے کا خدشہ ہے۔ خود بخود دب جائیں گے !"۔

شادی کر لوں ؟ ۔۔" شفقت نے زیر لب دہرایا۔ "تو یہ مجھے پھانسی پر چڑھ جانے کی تمہید تھی۔ انسان اپنی غرض کے لئے اندھا ہو جاتا ہے ! ۔ ایک تلخ اور طنزیہ مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر گئی۔

"میں تمہارے لئے اچھی لڑکی ڈھونڈوں گی۔ اپنے ہاتھوں تمہاری شادی

کروں گی۔ تمہاری دلہن میری بہو بن کر میرے گھر میں رہے گی۔ شفقت کیا میری
اتنی سی آرزو پوری نہیں کرو گے؟!"

"کیوں نہیں!" ان کے خشک لبوں سے نکلا۔ دل میں انگارے بھر گئے
کون ایسا ہے جو کسی کو کچھ دے اور اس سے لینے کی امید نہ رکھے۔ اور انہوں نے
تو اپنی خواہشوں کے پاؤں کھڑے کر رکھے ہیں۔ رائی سے ہاتھی بنایا ہے۔ وہ دل
ہی دل میں ہنسے۔ "بہت اچھا۔ محترمہ۔ ایک نفس کشی یہ بھی سہی۔ میں تو اپنی ذات
کو حادثوں کے لئے مختص کر ہی چکا۔"

اور شفقت اٹھ کر چلے گئے تب بیگم زیدی فکروں کے بوجھ تلے کراہنے لگیں
کیا سوچ کر بیگم صاحبہ نے انہیں یہ سب کچھ لکھ مارا تھا!۔ خط پڑھ کر وہ افسردہ ہو گئی
رہیں۔ خاطر انہیں منظور ہوئی۔ زیدی صاحب کی وہ عورت دیکھنے کی روادار نہ تھی
جس سے وہ ڈر گئیں بیمار ہو گئی تھیں۔ زیدی صاحب گھر کا رنگ عجیب دیکھ رہے تھے
ذاکرہ سب سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ عائشہ اور فرمان کی دنیا علیحدہ تھی۔ اور بیگم
تو کمرے سے باہر نکلتی ہی نہیں تھیں۔ بلکہ ان سے بات چیت کی نوبت نہیں آتی تھی۔

اس کے علاوہ وقت بے وقت پروفیسر رازی آ نکلتا تھا!۔ ایک دن اس نے
اپنی والدہ کو اپنا پیغام دے کر بھیج ہی دیا۔

زیدی صاحب ان سے تو کچھ نہ بولے۔ مگر ان کو ایک جواب دے کر وہ اپنی بیوی
پر گرجے برسے۔ "! بیگم اب تو صبر نہ ہوا۔"

"اشفاق بھائی میں کہتی ہوں۔ کیوں آپ کی باتیں دنیا سے نرالی ہوتی جا رہی ہیں
بھلا رازی کے یہاں آنے اور اس کے پیغام بھجوانے کی ذمہ دار شمسہ کیسے ہو گئی ہیں!
منع کر دیجئے کہ کوئی آپ کے گھر نہ آیا کرے!"

"اگر میں پہلے سے جانتا ہوتا کہ وہ بدمعاش اس نیت سے آ رہا ہے تو میں اسے

پہلی ہی بار اپنے یہاں نہ گھسنے دیتا!" وہ بولے۔ پھر رازی کا پیغام مسترد کر دیا گیا۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھلے بھی نہیں تھے کہ اُنھیں بڑی بیگم کا خط مل گیا۔ نہایت درجہ سوقیانہ تحریر تھی۔ شرمناک باتیں تھیں۔ اور سنجانے کیا کچھ تھا کہ خط پڑھ کر زیدی صاحب کے آنسو نکل آئے تھے۔ بیگم زمین ہی دھنسی جا رہی تھیں۔ معلوم نہیں کہ اب کیا آفت آئے۔ آخر وہ کیوں اُن کے پیچھے پڑی ہیں۔

"میں کہتا ہوں۔ وہ تمھارے معاملات میں کیوں دخل دیتی ہیں!" امتیاز صاحب نے کہا۔ "آخر وہ بلاوجہ لڑکی کی اور ایک بے خبر آدمی کی کیوں دشمن ہو گئی ہیں!"

زیدی صاحب پر بخار سوار تھا۔ "میں مجبور ہوں۔ امتیاز۔ اُن بدبختوں سے کوئی انتقام نہیں لے سکتا۔ اپنا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہوں۔ وہی سب کچھ دیکھنے سننے والا ہے!"

"میرا ایک مشورہ ہے۔ اشفاق اگر تم ٹھنڈے دل سے سنو" امتیاز صاحب نے کہا۔ "تم نے بے شک شفقت کو اس قابل کر دیا ہے کہ اب وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اتنا اور کرو کہ اُن کی شادی کر دو۔ کہنے والوں کے منھ خود بخود بند ہو جائیں گے!"

"پھر وہی شادی ــــ!" وہ آگ بگولا ہو گئے۔ "آخر میں کب کسی ناہنجار کے کہنے سننے کا پابند ہوں ــــ"

"تم نہیں سمجھتے ــــ اشفاق۔ اسی میں آئندہ کی بہبودی ہے۔ میرے ایک دوست ہیں۔ مل میں کام کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی چھوٹی بہن کے لئے کہا تھا۔ تم اِذن عطا کرو تو میں اُن سے گفتگو کر کے دیکھوں ــــ"

"میری رائے بھی یہی ہے ــــ" بیگم امتیاز بولیں۔ "کل کلاں کو لوگ یہ تو نہ

کہیں گے کہ اسی بے گمنام لڑکے کو پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں لڑکی کا ہاتھ دے دیں۔

"کیا یہ گناہ ہے؟" زیدی صاحب نے بے حد حیرت سے پوچھا۔
"اگر گناہ نہیں ہے تو کوئی اچھی بات بھی تو نہیں ہے ___!" بیگم زیدی نے کہا "اُن کی ذات پات کا کوئی پتہ نہیں۔ معلوم نہیں ماں باپ کون تھے؟ ___ کیا تھے؟
بس ختم کرو۔ تم اپنے بھائی بھاوج سے کیا کم ہو؟" زیدی صاحب نے پُرتنفر لہجے میں کہا۔

"پھر وہی دلشکن بکواس ___!" امتیاز صاحب نے للکارا۔
"میں کہتا ہوں کہ کیا شفقت دودھ پیتے بچے ہیں؟" زیدی صاحب جھلا گئے "اُن کی اپنی مرضی اور پسند کا کوئی سوال نہیں ہے۔ جہ چاہا کر دیا اُن کے ساتھ ___ یہ کیا مذاق ہے؟ ___"

"تو اُن سے پوچھنے میں کیا حرج ہے؟" امتیاز صاحب نے رائے دی۔
"ہمیں لوگ پوچھنا ہیں نہیں پوچھوں گا! ___" زیدی صاحب نے کہا۔
پھر ملازم کو بھیجا گیا کہ شفقت کو بلا لائے۔
"ایک فرد کی بہبودی کی خاطر دوسرے ناکردہ گناہ کو جبر کی صلیب پر مصلوب کرنا کہاں کا انصاف ہے؟" زیدی صاحب بڑبڑائے۔

"فرد کی بہبودی بھی تو نہیں چاہتے آپ؟ ___" بیگم امتیاز نے کہا۔
اتنے میں کھلے دروازے میں شفقت کی قد آدم شبیہہ نظر آئی۔
"آؤ۔ میاں۔ نظر ہی نہیں آتے۔ کیا کیا کرتے ہو؟ ___" امتیاز صاحب نے کہا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو پر بٹھا لیا۔
"کوئی خاص مصروفیت نہیں رہتی جناب! ___" وہ سر جھکا کر بولے۔

"میں تو ابھی سے ان کے لئے کوشش کر رہا ہوں"۔ زیدی صاحب نے کہا۔

"ایم۔ ایس۔ سی کرتے ہی لیکچرر ہو جائیں گے۔ انشاءاللہ۔ شادی۔ بھی کردی جائے گی!۔"

شادی۔ تو پھر یہی مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ زیدی صاحب یہ کہہ دیں کہ میں صالحہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں۔ یک بیک قوس قزح کی رنگینیاں اُن کے تخیلات میں چمکنے لگیں۔ بلندترین خوابوں کی تعبیر کی تلاش میں وہ یکبارگی ساتویں آسمان پر پہنچ گئے۔ دل دھڑک اٹھا۔ صالحہ اپنی تمام تر سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"تم سعادت مند ہو۔" زیدی صاحب کہہ رہے تھے "تم نے آج تک میرا کوئی حکم نہیں ٹالا۔ مجھے خوشی ہے۔ میں نے امتیاز سے تذکرہ کیا تھا۔ اُن کے کسی دوست کی بہن ہے۔ سوال تمہاری مرضی کا ہے۔ اگر تمہیں میری خواہش کا احترام منظور ہے تو۔۔۔۔۔۔!"

اور شفقت ساتویں آسمان سے سر کے بل گرے تو تحت الثریٰ کی تاریک گہرائیوں میں پہنچ گئے۔

بھلا کون سا خواب سچا ہوتا ہے؟۔ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے انھوں نے دبی زبان سے کہا۔

"کوئی دشواری اگر ایسی آن ہو بابا جان کہ وہ میری شادی کے بغیر نہ سلجھ سکتی ہو تو پھر مجھے بھی راضی سمجھئے۔ آپ کی خواہش میری زندگی ہے!۔"

وہ سب چپ ہو گئے۔ شفقت آہستہ سے اٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔

اپنی ذات سے طوفان اٹھتے دیکھ کر صالحہ بے چین ہو گئی۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ شفقت کی قربانی کسی صورت منظور نہیں کرے گی۔ سارے حالات کا اسے علم تھا۔ ایک ایک تفصیل بیگم امتیاز نے اس سے کہی تھی!۔

پھر شفقت سے ملنے کا موقع بھی مل گیا۔ ایک شام اس نے انھیں باغ کی تاریکیوں میں گم ہوتے دیکھا تھا! حوض کی منڈیر سے ٹیک لگائے وہ ننھے ننھے تاروں کو دیکھ رہے تھے۔ جن میں اُن کی تقدیر کا کوئی ستارہ نہیں تھا۔

"یا پروردگار۔ اس رات کی سحر میرے نصیب سے مٹا دے۔ میں ناکردہ گناہوں کی سزائیں بہت سی بھگت چکا ہوں۔ اب مجھ میں طاقت نہیں ہے اے تقدیر۔ نہ ستا مجھے اب"

"تقدیر کو الزام نہ دیجئے۔ یہ میری بدنصیبی ہے:"

"صالحہ تم؟" انھوں نے حیرت سے کہا۔

"بابا جان نے جھوٹے غرور اور بے بنیاد اصولوں پر خود کو قربان کر دیا ہے۔" صالحہ نے کہا: "وہ میری بے خردمیوں کا بدلہ آپ سے لینا چاہتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ یہ بزدلی اور کم ہمتی ہے!"

"صالحہ میں کسی کا شکوہ نہیں کرتا۔"

تو پھر آپ اتنے مجبور بن کر کیوں رہ گئے ہیں۔ میں ایک ناواجب ستم آپ پر ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ خدارا انکار کر نہ دیجئے آپ اپنی ترقی میں کیوں روڑے اٹکانا چاہتے ہیں!"

"صالحہ تمہارا اس وقت یہاں آنا مناسب نہیں ہے" شفقت نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ کوئی ہمیں دیکھ لے۔ میری نیت صاف ہے۔ میں تمہاری نیت پر بھی شبہہ نہیں کرتا۔ مگر دیکھنے والوں کو کون سی تاویل مطمئن کر سکے گی!"

"آپ کی پریشانیاں میرے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ ہم نے آج تک آپ سے انصاف نہیں کیا۔ آپ کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا کہاں کی شرافت ہے!"

"صالحہ۔ جو کچھ ہوتا ہے۔ اسے یونہی ہونے دو۔ ممکن ہے کہ آنے والی پریشانیاں اسی طرح دور ہو سکیں۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ بابا جان کی عنایتوں کا بدلہ کسی نہ کسی صورت سے ادا کر دوں۔ چاہے ہمیشہ کے لئے میں جانی بوجھی موت کو گوارہ کرتا رہوں"

"مگر میں ہمیشہ بے چین رہوں گی!"

"صالحہ مجھے تمہاری بھلائی بھی منظور ہے۔ اگر میری زندگی کی قربانی تمہارے لئے کوئی دلخوش کن فیصلہ بن سکتی ہے تو مجھے اپنی قربانی سے انکار نہیں ہے!"

صالحہ روتی رہی۔ وہ خاموش بیٹھے رہے۔ اور پھر جب دیر ہو گئی تو وہ صالحہ کو منائے سمجھائے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔

اور رات کی تاریکی میں گھلی ملی گرتی پڑتی دل پر غم کے پہاڑ اٹھائے وہ واپس آ گئی۔ کسی کو کسی کے دردِ نہاں کی خبر نہ تھی! وہ اپنے کمرے میں آئی اور تصویرِ درد بن کر بیٹھ گئی۔

شفقت راضی ہو گئے۔ زیدی صاحب کو اطمینان تھا! ـــ مگر انھیں خبر

نہیں تھی کہ ایک بہت بڑا جذباتی صدمہ انھیں پہنچنے والا تھا! —

شام کی چار پر امتیاز صاحب کے دوست آئے۔ انھوں نے شفقت کو بے حد پسند کیا تھا! — پھر اُن کے رخصت ہونے کے بعد انھوں نے شفقت کا شجرہ نسب پوچھا۔ وہ زیدی صاحب کا منھ دیکھ کر رہ گئے۔ زیدی صاحب نے جھجکتے ہوئے سارے حالات بیان کر دیئے۔ امتیاز صاحب کے دوست کچھ دیر سوچتے رہے پھر معذرت آمیز لہجے میں بولے۔

"معاف کیجئے گا۔ ان حالات میں تو رشتہ نہیں ہو سکتا۔ میں اہل سادات سے ہوں۔ میرے خیال میں اب یہ رشتہ ممکن نہیں۔"

"مگر وہ بحمد اللہ مسلمان ہیں! —" امتیاز صاحب نے کہا۔

"جناب۔ دوسروں کی خیر خواہی کے لئے ہم بڑے وسیع المشرب اور روشن خیال بن جاتے ہیں اور جب ذاتی وقت ہم پر پڑتا ہے تو سب سے پہلے منھ چھپاتے ہیں۔ گستاخی معاف۔ میری بہن آپ کی صاحبزادی سے کیا کم ہے۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ! —"

اور پھر دیر تک دونوں گم سم بیٹھے کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح آپس میں نظریں ملائیں مگر کامیاب نہ ہو سکے! —

شفقت کو پتہ چل گیا۔ انھوں نے استہزائیہ انداز میں ہنس کر امتیاز صاحب سے پوچھا۔

"فرمایئے جناب! جو کچھ آپ کو سننا نہیں چاہیئے تھا وہ بھی آپ نے سن لیا؟"

"میاں کسی کی بکواس کا اثر نہ لو" امتیاز صاحب گھبرا گئے۔

"بکواس ہوتی تو بلا شبہ اثر نہ لیتا۔ مگر یہ تو حقیقت ہے! —" وہ ہنسے۔

"آپ البتہ اثر نہ لیجئے۔ خواہ مخواہ ایک کم رتبہ آدمی کو اعلیٰ درجات دے کر آپ کب

نے اپنی فکریں بڑھالی ہیں۔ میں نے ایک تدبیر سوچ لی ہے۔ اب سب کی
پریشانیاں دور ہو جائیں گی!"

امتیاز صاحب بہت کچھ سمجھا بجھا کر چلے آئے۔ شفقت کو دکھ بھرے خیالوں
کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن چھوڑ کر۔

میرا یہ ایثار بھی کسی کام نہ آسکا۔ کتنی بڑی بے حیائی ہے کہ میں ذلت و
رسوائی کا ہر حملہ سہنے کے بعد بھی جوں کا توں اپنا ناپاک چہرہ سب کو دکھاتا
پھرتا ہوں۔ آخر میں کیوں دوسروں کے رحم و کرم پر پڑا رہتا ہوں۔ کیوں
اپنی نگاہوں میں آپ قابل رحم ہوں۔ انسانوں کے اس بھرپور سمندر میں کیا
میرا مقام ایک قطرے کے برابر بھی نہیں ہے!"

وہ سوچتے رہے ٹہلتے رہے!

اور دوسری صبح کو وہ گھر میں نہیں تھے! اُن کے کمرے میں ایک پرزہ
زیدی صاحب کے نام لکھا ہوا ملا۔

"بابا جان۔ جو کچھ مجھ سے برداشت نہ ہوسکا، وہ آپ کے لئے
بھی ناقابل برداشت ہوگا۔ میں جا رہا ہوں۔ شاید اس زندگی
میں تو آپ سے ملنا نہ ہو سکے۔ دعا کیجئے کہ حشر کے دن ہی مل سکوں
اگر میرا منہ اس قابل ہوا تو۔ آپ کے گراں بہا احسانوں سے
عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ مجھے معاف کر دیجئے گا۔

شفقت

گھر بھر کو ایک بلیغ سناٹے نے نگل لیا۔ یہ کس نے سوچا تھا کہ حالات یہ رخ
اختیار کر لیں گے۔ زیدی صاحب کو بڑا شاک لگا! گم صم سے وہ بس
سوچتے ہی رہ گئے۔

صالحہ سناٹے میں رہ گئی اس کی نظر دل تے شفقت کی مجبور بے بس شکل بکھر رہی تھی!۔

"ہم نے انھیں بیٹے کی طرح پالا تھا!" زیدی صاحب آہیں بھر رہے تھے

عائشہ رو رہی تھی "باباجان۔ آپ نے انھیں بیٹے کی طرح پالا تھا مگر بیٹے کی طرح سمجھا نہیں تھا۔"

"سچ کہتی ہو بیٹی۔ سچی بات ہے۔" وہ بے چارے خاموش رہ گئے۔

عائشہ بہت روئی۔ رو رو کر وہ پھاٹک کی طرف دیکھتی "خدا کرے کہ شفیع بھیا چلے آئیں۔ ان کا کہیں دل نہ لگے۔ یکبارگی دروازہ کھلے اور وہ نظر آجائیں"

مگر وہ نہیں آئے۔

پھر سب کو مصروفیتوں نے گھیر لیا۔ ایک غیر متعلق انسان کی موجودگی یا غیر موجودگی ایسی اہم کہاں تھی کہ عمر بھر کا سوگ لے لیا جاتا!۔

مگر صالحہ بہت متاثر تھی۔ ایک دن وہ چپکے سے ان کے کمرے میں گئی جو بند کر دیا گیا تھا۔ دروازے کھولے اور ایک بدبو کا بھبکا سا نکلی۔ ہوا اور گرد اندر آ رہی تھی۔ رات کی رانی کی سوندھی مہک آس پاس بکھری ہوئی تھی

صالحہ نے دیکھا کہ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ ان کے کپڑے، جوتے، کتابیں، حتیٰ کہ پیپر ویٹ کے نیچے کچھ نوٹ بھی رکھے تھے!۔ وہ سب کچھ چھوڑ گئے تھے۔

صالحہ ان کے بستر پر بیٹھ گئی۔ خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ شفقت کی کسمپرسی پر آنسو بہائے یا اپنی محرومی پر۔

پھر اس نے ان کا کمرہ صاف کیا۔ اپنی عمر میں پہلی بار۔ سب کچھ قرینے سے رکھ دیا۔ اس کی نظر گلدستہ میں رکھے ہوئے ایک نوٹ کیس پر پڑی جس میں دو دو قفل پڑے ہوئے تھے۔ صالحہ نے چپکے سے انھیں ہلایا اور وہ

یکبارگی کھل گئے۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے تالے ہٹائے اور ڈھکنا کھولا۔ معلوم نہیں کیا دیکھنے کو ملے گا؟۔ اور اس نے جو کچھ دیکھا وہ اُسے پاگل کرنے کو کافی تھا۔ سوٹ کیس میں بہت سے قلمی تراشے، مسودے اور نامکمل افسانے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ ٹرنک کے ڈھکنے کے اندر جلی حروف میں تحریر تھا

شفقت گمنام!!!

ڈھکنا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں قابو سے باہر تھیں سارا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا!۔ آنسو چل رہے تھے۔ رگوں میں آتشِ سیال بہہ رہی تھی۔

گمنام۔ اس کا پسندیدہ کہانی کار۔ جس کے قرب کی خواہش نے اُسے بےچین کر رکھا تھا۔ جس کے دید کی وہ ازل سے پیاسی تھی۔ وہ شفقت ہی تھے!۔

اس راز کو شفقت نے کیوں چھپایا تھا۔ کیوں؟۔ وہ آہستہ آہستہ رونے لگی یہ غم اس سے سہا نہ جا سکا!۔ جب وہ اپنے محبوب کے کمرے سے نکلی تو اس طرح جیسے خون کا آخری قطرہ بھی دل کی گہرائیوں سے نکل جائے۔

وہ رات اس پر کرب و الم کی رات بن کر چھا گئی۔ کیسا عجیب ذکر تھا۔ کتنا جان لیوا غم ــــ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے گریۂ بےاختیار کی وجہ کیا تھی؟۔ ماں باپ پوچھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ معلوم نہیں کہ انہیں کیا جواب ملے۔ عائشہ اس کا دُکھ جانتی تھی!۔

"باجی۔ کیا آپ شفقت بھائی کو زندہ درگور کر دیں گی؟" ـــ لہجہ بڑا مضطرب تھا۔

"باجی۔ خدا کے واسطے۔ کہئے۔ آپ کو کیا یاد آرہا ہے؟" ـــ عائشہ اپنی بے تاب تھی۔ مگر وحیدہ کے لبوں سے کچھ نہ نکلا!۔

"بیٹی تمہیں کون تکلیف ہے؟" بیگم امتیاز کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"میری بچی۔ مجھے بتاؤ۔ کیا بات ہے؟ کیوں تم اتنی بیقرار ہو؟"

"ممی۔ میں نہیں کہہ سکتی۔ مجھے کیا یاد آ رہا ہے؟!" صالحہ بولی اور پھر گم سم ہو گئی۔ اکیلے میں زیدی صاحب نے اُن سے کہا "یقیناً اس پر شفقت کی جدائی کا اثر ہے۔ مگر وہ کہہ نہیں سکتی۔ آپ اُسے تسلیاں دیتیں۔ زہرہ بہن!"

"ہائے میری بچی۔ اگر آج کے دن گھر بار کی ہوتی تو یہ دکھ کیوں ہوتی؟" بیگم زیدی بیقرار تھیں۔ "وہ لڑکیاں کتنی خوش نصیب ہیں۔ جو پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ جن کے باپ سنگی نہیں ہیں!"

زیدی صاحب کا قلب اُلٹا جا رہا تھا۔ وہ صالحہ کے آنسو برداشت نہیں کر سکتے تھے انھوں نے بالا بالا کئی مقامات پہ دریافت کرایا۔ مگر شفقت کا پتہ نہیں چلا۔

پھر تعلیم سے اُسے دلچسپی باقی نہ رہی۔ دن سوگوار گزرتے۔ راتیں عذاب بن جاتیں۔

آہ! شفقت۔ تقدیر زمانے نے بہت ستایا جلایا دکھ دیا۔ مجھے زندگی سے اتنے رنج اٹھانے کہ تمہیں روکنے کی مجال نہ رہی۔ تم مجبور تھے کچھ نہ کہہ سکے۔ آہ۔ اگر تم میرے وجود میں جھانک کر دیکھ سکتے تو دیکھتے کہ ذہن میں طوفان خیز سمندر موجزن ہیں دل میں لاوے پک رہے ہیں۔ سینے میں آتش فشاں پھٹ پڑے ہیں۔ ساری دنیا تہ و بالا ہے۔ شفقت! اگر دل کو دل سے راہ ہے تو خدا کے واسطے چلے آئیے۔

مگر ماہ و سال کی گردش جاری رہی۔

وہ اندر سے بالکل کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اب اسے بربادی کا غم بھی نہیں تھا وہ اپنے باپ کو اپنی تباہی کا ذمہ دار گردانتی تھی! اس نے بتہیہ کر لیا تھا کہ ان سے بدلہ لے کر رہے گی۔ ایسا بدلہ کہ وہ بھی آسی کی طرح تڑپیں سسکیں بیقرار رہیں۔ مگر کوئی راہ نظر نہ آ سکی۔!

صالحہ اپنے غم کی آپ رازدار تھی۔ دن رات گھلتے گھلتے شمعِ کشتہ بن گئی تھی۔ جو نہ تو جلے نہ روشنی دے۔ بلکہ اپنے دھوئیں میں آپ کھو جائے۔

اب اس کی شادی کی بات چیت بھی دور جا پڑی تھی۔ اچھے اچھے رشتوں کو زیدی صاحب نے ٹھکرا دیا تھا۔ بیگم زیدی اپنی عمر سے کہیں زیادہ ضعیف لگتی تھیں۔ تقدیر پر شاکر۔ اور متوکل۔ وہ تو عائشہ کو دیکھ دیکھ کر نیم جان ہوا کرتیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو برس میں بڑی حد تک بدل گئی تھی! ــ بے حد سنجیدہ۔ سمجھدار۔ اور خاموش۔!!

سب کچھ جوں کا توں تھا!ــ

پھر اچانک فرمان کے اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ جانے کا شور اٹھا۔ بیگم امتیاز اس کے خلاف تھیں۔ مگر وہ بڑے اعلیٰ نمبروں سے بی۔ اے میں کامیاب ہوا تھا اور کے ایک پروفیسر آتے اپنے ساتھ لے جانے پر مُصر تھے!ــ

فرمان ماں کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا!ــ لیکن وہ اپنی آرزو کے آگے سرنگوں بھی تھا!ــ عائشہ کے دل پر دھچکا سا لگا۔ وہ خود کو اس سے بہت قریب پاتی تھی۔ کتنے بہت سے دن وہ سب ساتھ ساتھ رہ چکے تھے!ــ

"تو تم سچ مچ چلے جاؤ گے۔ فرمان!ــ" وہ بہت دلگرفتہ تھی!ــ

آپ اگر کہیں تو میں چھوٹ موٹ جاؤں؟ــ" وہ شرارت سے مسکرایا۔

فرمان۔ تمہارے بغیر۔ اگر دل نہ لگے۔ تو ــ ہم کیا کریں؟ــ"

"سچ مچ۔ اس قدر میں آپ کو اس قدر عزیز ہوں؟ــ" وہ بولا اور ایسی سنجیدہ۔ نظروں سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ گڑبڑا گئی۔

"آپ اپنا مقصد یاد رکھئے ــ" اس نے بزرگوں کی طرح سمجھایا۔ یاد کا دوگنا برا ہوتا ہے میں ہمیشہ آپ کو اپنے قریب محسوس کرتا رہوں گا۔ اور سدا چپ رہوں گا۔ جانی بوجھی باتیں۔ اس وقت کی بات۔ آپ میرے پاس ہیں۔ آپ کے خوبصورت چہرے

پڑا اور اس شاموں کی سرمئی پرچھائیاں کانپ رہی ہیں۔ آپ رونا چاہتی ہیں مگر یہ
خیال آپ کے آنسوؤں کو تھام رہا ہے۔ سنئے! آپ کبھی نہ رو دیجئے گا۔ میں تو اتنا جانتا
ہوں کہ کوئی سا جذبہ اچھا ہو یا برا۔ اگر سچا ہو تو دوسرے کے دل پر ضرور اپنا عکس
ڈالتا ہے۔ اگر آپ نے یہاں آنسو بہائے تو میں وہاں رو دوں گا۔ یہاں جب تم ہاتھ سے
آپ کے آنسو پونچھ دیں گے وہاں کون ہوگا جو میرے آنسو پونچھے گا۔ میرا اپنا کوئی نہیں۔

اچھا فرزان۔ وہ دل پر جبر کر کے مسکرائی۔
بس ممی کا اور اپنی ممی کا خیال رکھئے گا۔ دونوں دکھی ہیں! معلوم نہیں اس نے
کیوں کہا تھا۔

"فرزان تم جلدی واپس آؤ گے نا؟"
"بہت جلدی —" اس نے مسکرا کر اس کے بال بکھیر دیئے۔ "ابھی آخر کیا عجلت
ہے۔ تھوڑے دنوں کے لئے جا رہا ہوں۔ واپس آجاؤں گا۔ اللہ میاں کے پاس تھوڑی
جا رہا ہوں کہ واپس نہ آسکوں"

"فضول بکواس نہ کرو۔ کیا ناحق دل دکھانے سے!—"

"آپ نے پھر انگوٹھی اتار دی — ؟"

"قیمتی ہے۔ کہیں رکھ کے بھول گئی تو پھر —!"

"دل سے لگی ہو تو آدمی کوئی چیز کہیں رکھ کے نہیں بھولتا —"

"فرزان تم دل جلی باتیں کرو گے تو میں اب رو دوں گی!—"

"ہائیں! — ہر بات الٹی سمجھتی ہیں۔ اچھا چلئے۔ رو دیجئے۔ میں بھی اسٹارٹ
لے رہا ہوں۔ ہم دونوں مقابلہ بازی —!"

"اچھا فرزان — سنو —" اس نے اس کی بات اڑا دی "تم بڑے خراب ملک میں
جا رہے ہو — وہاں خود کو محتاط رکھنا۔ دو روشنیوں کا شہر ہے۔ جہاں آنکھیں

خیرہ ہو جاتی ہیں۔ تم کہیں ٹھوکر نہ کھانا۔ فرمان ۔۔۔ تم ممی کا اکیلا سہارا ہو۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ جیتے جی انھیں تمھارا داغ سہنا پڑے۔ فنی۔ وعدہ کرو نکھرے
ستھرے رہو گے!۔۔"

"واہ اللہ۔ آپ دیکھئے تو سہی۔ بیکار وہم کرتی ہیں!" وہ ہنس پڑا۔ فرمان
"مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اپنے عقیدے درست کر لو گے!۔" اس نے اس کا تمسخر
نظر انداز کر کے نصیحت کی "تم جہاں جاؤ گے وہاں تمھیں خدا ملے گا۔ پھر اس کی
ہستی سے انحراف کیسا نہیں ہو۔"

"بالکل نہیں ۔۔ چلئے میں آپ کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں۔"
اس نے آسمے بے شمار نصیحتیں دیں۔ آنسو بہے اور سوچا کہ وہ اپنا مستقبل بنانے
جا رہا ہے جب آسمے اور اس کے ماں باپ کو کوئی غم نہیں تو پھر وہ کیوں بے چین
ہو رہی ہے۔

پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ سب لوگ آسمے ایئروڈروم رخصت کرنے پہنچے
اور ایک نامعلوم مدت کے لئے فرمان ان سب سے رخصت ہو کر امریکہ چلا گیا۔
صالحہ بیگم امتیاز کے خیال سے آسمی کے پاس چلی آئیں۔ عائشہ تنہا رہ گئی۔ ان
دنوں بیچاری نانی کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی!۔ تو صالحہ پر انھوں نے خانہ داری
کا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں سمجھا اور ادی سے اپنی نند کو بلوا بھیجا۔

ویسے صالحہ کی موجودگی سے انھیں بڑی ڈھارس ہوتی تھی۔ مگر اب تو وہ بھی
دیکھ رہی تھیں کہ وہ ادی اب پگھلتی جا رہی ہے۔ انھوں نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ فرقت
کے جانے کے بعد اس نے کبھی رنگین لباس نہیں پہنا تھا!۔ ہر وقت خود فراموش
رہتی تھی۔ پڑھنے لکھنے میں اس کی وہ دلچسپی برقرار نہیں تھی جو پہلے کبھی تھی اور
ایک دن اس نے غضب ہی کر دیا کہ اپنے سارے نامکمل افسانے اٹھا کر جلا دیئے۔

صحن میں ڈھیر کر کے آگ لگا دی۔

"بیٹی — یہ کیا کیا تم نے ؟" بیگم امتیاز ہکا بکا تھیں۔

"اب کسی چیز میں جی نہیں لگتا۔ ممی —" وہ بولی — "قلم کاغذ اور جذبات یہی تینوں میرے دشمن تھے۔ برباد کر دیا مجھے! میں اب کبھی نہیں لکھوں گی!"

"میری بے چاری بچی —" وہ آہ بھر کر رہ گئیں۔

رات کو انھوں نے امتیاز صاحب سے تذکرہ کیا۔

"کیا آپ کا دل بھی رحم و محبت سے خالی ہو چکا۔ صالحہ کو آپ نے اپنی بیٹی بنایا تھا مگر آپ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے ہونٹوں پر مہر لگی ہے۔ دل جل رہا ہے۔ آخر کب تک اشفاق صاحب اس کا صبر آزماتے رہیں گے۔ لوگوں کے کہنے سننے سے شفقت پر ایسا الزام لگایا کہ اسے گھر سے نکال کر دم لیا۔ میں تو کہتی ہوں کہ صالحہ دل سے اسی کو چاہتی تھی۔ اسی کی جدائی میں اس کا حال ابتر ہے۔ کچھ اشفاق صاحب کو یاد دلائیے نا۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں زہرہ — وہ تو اس معاملے میں کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے ہیں۔"

"کہہ کے تو دیکھئے نا —" بیگم امتیاز نے ان پر زور ڈالا۔ اور دو تین دن کے بعد جب امتیاز صاحب کو موقع ملا تو انھوں نے دبی زبان سے سب کچھ کہہ دیا۔

"اشفاق — بڑے بڑے بوڑھوں نے حالات کی نزاکت کے ساتھ سپر ڈال دی ہے۔ اب تم بھی اپنی ضد چھوڑ دو۔ صالحہ کے لئے سب جو کچھ ہم سوچتے تھے ختم ہو چکا۔ تم نے اندازہ نہیں لگایا شفقت کی گمشدگی کے بعد سے اس کا کیا حال رہتا ہے۔ میں اس پر الزام نہیں لگا رہا ہوں۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ اگر اس کی زبان پر حرفِ تلخی کو ختم کرے تو دنیا سے آخر نہ ہو

حال سے احتجاج کرتی ہیں! —

امتیاز — "زیدی صاحب کا عجیب حال ہوگیا۔ چہرہ زرد۔ جیسے یک بیک برقان نے حملہ کردیا ہو۔ مردہ لہجے میں بولے "تم سچ کہتے ہو۔ میری بزدلی اور بدنامی نے مجھے یہ دن دکھایا کہ میں کہیں کا نہ رہا۔ امتیاز۔ میں تم سے سچ کہوں — کہ میں ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ ایک نہ ایک دن میں صالحہ کا ہاتھ شفقت کے ہاتھ میں دے دوں گا! —"

امتیاز صاحب حیرت اور تعجب سے انھیں دیکھنے لگے! —

"اسی لئے میں نے تمام پیغام ٹھکرا دئے۔ وہ بھی انہیں ہار رہا۔ صالحہ کی اعلیٰ تعلیم کا بہانہ کیا۔ مگر سب بیکار —" زیدی صاحب کا لہجہ ٹوٹنے لگا "امتیاز۔ میں بہت بزدل ہوں کہ بیٹی کے جذبات کا خون کرنے کے الزام میں مجھے بھی گردن زدنی قرار دیا جائے۔ آہ — امتیاز — تم یقین کرو یا نہ کرو شفقت میرے۔ حقیقی بڑی بہن کا لڑکا ہے!"

"اشفاق؟" — امتیاز صاحب نے تعجب سے کہا!

"بات چونکہ اپنی ہے۔ مگر بے حد برتر کا ہے۔ اسی لئے اب تک میرے منھ سے نہیں نکلی۔ اور یقین بھی کون کرتا ہے؟ — والدین کے انتقال کے بعد میں آپا کو برار میں چھوڑ کر حیدرآباد پڑھنے چلا آیا۔ یہاں کی مصروفیات میں میرا دل ایسا لگا کہ میں دو تین سال تک برار واپس نہ جا سکا۔ آپا اپنے مکان میں تنہا رہتی تھیں صرف ایک بوڑھی ملازمہ اُن کی نگراں تھی۔ وہی ان کی خیریت کی اطلاع مجھے دیتی تھی!"

اچھا! — یک بیک امتیاز صاحب کا چہرہ متغیر ہونے لگا! —

"آپا سے جدا ہوئے دو تین سال ہو رہے تھے کہ ایک دن اچانک مجھے ملازمہ کا تار ملا۔ آپا کی طبیعت سخت خراب تھی۔ انھوں نے مجھے فوراً ہی بلایا تھا! میں نے

خود پر نفرین کی کہ میں نے اتنے دن ان کی خبر نہیں لی... بہر حال میں پہلی ٹرین سے گھر پہنچا۔ مگر میں نے کیا دیکھا۔ امتیاز — میری نا کتخدا جوان بہن نے ایک لڑکے کو جنم دیا تھا اور میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد کچھ کہے سنے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئی! —"

"کیسے یہ حقیقت میرے بعد ان سے نکلی کہ میری بہن نے ایک ایسا شرمناک جرم کیا تھا! — میں نے ملازمہ سے حال دریافت کیا۔ پتہ چلا کہ ایک درندہ اپنی شرافت کا جال بچھا کر اس کو لوٹ لے گیا۔ وہ کرایہ دار کی حیثیت سے آ کر رہا تھا۔ دونوں میں میل جول بڑھتا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ ایک رات اُس کم ظرف و ذلیل آدمی کے رشتہ دار آئے اور آتے جبراً پکڑ دھکڑ کر لے گئے۔ ملازمہ نے مجھے اس بدکار کا حلیہ بھی بتایا تھا! — مگر میں اُسے کہاں تلاش کرتا۔ معلوم نہیں وہ کہاں گیا۔ کہاں گیا۔ آیا کے بچے کو میں نے چاہا تھا کہ گلا گھونٹ کر مار ڈالوں۔ پھر مجھ پر خوف خدا غالب آیا۔ میں نے اپنے ایک لاولد دوست کو وہ بچہ دے دیا۔ جہاں وہ چار سال تک اطمینان سے پرورش پاتا رہا۔ پھر مجھے اطلاع ملی کہ اچانک میرے دوست نے حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کیا۔ بچہ پھر بے سہارا تھا۔ ایک شام میں اُسے اپنے گھر لے آیا اور مشہور کر دیا کہ یہ مجھے دروازے پر پڑا ہوا ملا تھا! —"

"تمہاری بہن کا نام کیا تھا — اشفاق؟"

"کیا کرو گے پوچھ کے۔ امتیاز — اب نہ وہ رہی نہ اس کی نشانی رہی۔ [illegible] یہ داغ میرے دل پر رہ گئے ہیں۔ جن کو میری موت کے شعلوں کے سوا کوئی نہ دھو سکے گا! —"

[illegible] امتیاز نے جب رومال سے اپنا چہرہ چھپالیا اور بچوں کی طرح

رو پڑے۔ زیدی صاحب حیرت سے انھیں دیکھنے لگے۔

"ساجدہ کی دردناک موت کا ذمہ دار میں ہوں۔ اشفاق۔ وہ بکھرے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے!۔ یقین کرو کہ میں وہ بدنصیب ہوں جس نے ساجدہ کی محبت کا دم بھرا تھا۔ میں نے اُن سے فرضی محبت کا کھیل نہیں کھیلا۔ وہ خود کو بے سہارا محسوس کرتی تھیں۔ میں نے اُن سے نکاح کر لیا تھا!"

امتیاز ۔۔ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟" زیدی صاحب نے انھیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

"دورانِ تعلیم ہی میں میری منگنی زہرہ سے کر دی گئی" امتیاز صاحب نے آنسو پونچھ کر کہا "مگر ساجدہ کی اتھاہ محبت میں ڈوب کر میں نے گھر والوں کو لکھ دیا کہ مجھے نہ زہرہ پسند ہے نہ اس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ والد مرحوم سخت گیر تھے۔ انھوں نے ایک رات زبردستی مجھے پکڑوا لیا۔ خدا بہتر جانتا ہے اشفاق۔ میں کتنا مضطرب اور بے قرار رہا تھا! ۔۔ مگر مجھے انھوں نے ایک کمرہ میں بند کر دیا تھا! ۔۔ طرح طرح کی دھمکیاں دی تھیں۔ مارا پیٹا تھا! ۔۔ اور میں تب بھی زہرہ سے شادی پر رضامند نہیں ہوا تب والدہ نے دھمکی دی کہ وہ زہر کھا لیں گی۔ ایک دن وہ میرے مسلسل انکار سے پریشان ہو کر میرے پاس آئیں۔ ایک ہاتھ میں ان کے زہر کی شیشی تھی دوسرے ہاتھ میں کلام پاک جسے میرے سر پر رکھ کر انھوں نے کہا کہ اگر میں نے اُن کا حکم نہیں مانا تو وہ زہر کھا لیں گی۔ مجھے ان کا حکم بے بس ماننا پڑا۔ اشفاق ۔۔ اور میری شادی زہرہ سے ہو گئی پھر میں آزاد ہونے کے بعد سب سے پہلے بردار گیا مگر یہاں کی دنیا ہی زیر و زبر ہو چکی تھی۔ مکان پر دوسرے لوگوں کا قبضہ تھا۔ انھوں نے ساجدہ کے سلسلہ میں کوئی نشان دہی نہ کی۔ نہ مجھے ملازمہ مل سکی۔ یہ تو مجھے گمان بھی نہیں

تھا اشفاق کہ ساجدہ تمہاری بہن تھیں۔

زیدی صاحب کا پژمردہ چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا! — وہ غافل ہو گئے تھے۔

"یا اللہ — میرے حال پر رحم کر —" امتیاز صاحب گڑگڑا رہے تھے: یہ مجھے کب معلوم ہوا کہ شفقت میرا بیٹا ہے۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ خدا سمیع و بصیر ہے۔ وہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔ آہ — شاید — ایک مجبور ہستی سے بیوفائی کی سزا مجھے ملی تھی کہ جوان لڑکی مجھ سے جدا ہو گئی — آہ — میرے بچے — تم پانچ پانچ میرے اپنے بیٹے تھے۔ اب تم کہاں ملو گے شفقت؟ — کیا یہ سچ ہے۔ یقین نہیں آتا! —"

وہ پھر رونے لگے۔ ہچکیاں لگ گئیں۔

"اب بتاؤ میں بدنصیب کو کہاں ڈھونڈوں؟ — امتیاز —؟!" ایک کربناک آواز کی صورت میں زیدی صاحب کے لبوں سے نکلا: "تمہارا بیٹا۔ میری مرحوم بہن کا بچہ۔ کہاں ہے۔ وہ کہاں ہے؟ —"

ان کے قلب کی عجیب کیفیت تھی۔ جیسے کوئی ٹکڑے ہو کر اندر اندر گر رہا تھا!

"کسے یقین آئے گا۔ سب سے کیسے کہوں گا؟ —" امتیاز صاحب از خود رفتہ تھے: "میری زندگی کا یہ المناک پہلو۔ جو آج تک سب کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ یک بیک سامنے آ جائے گا! —"

زیدی صاحب بھی کوئی جواب نہ دے سکے۔ ان کے حواس گم، دماغ ماؤف اور اعصاب شکستہ تھے۔

وہ اپنے راز کی آپ تشہیر بن گئے۔ معلوم نہیں کیسے کیسے طوفان روح فرسا خیالات تھے جنہوں نے انہیں بالکل ہی از خود رفتہ کر کے رکھ دیا۔ قلبی ہیجان شدید تھا

دماغی خلفشار بھی اتنا ہی زبردست تھا! — معلوم نہیں کیا ہو۔ چپ چپ رہتے
تھے۔ اکیلے زیدی صاحب اُن کے رازدار تھے وہ بھی بدحواس ہی تھے —؟!

"امتیاز۔ خدا پر نظر رکھو۔ میں تو تم سے کہہ کے پچھتایا۔ تمھارے دل کی تڑپ اگر
موثر ہوگی تو وہ انشاءاللہ جلد ہی واپس آجائیں گے! —"

"اشفاق۔ ہائے کاش میں بے صبر رہتا —"

"یہ آخر انھیں کیا ہوا ہے؟" اُن کی بے چینی سے گھبرا کر بیگم امتیاز نے زیدی
صاحب سے پوچھا۔ وہ بھی تھکی تھیں مگر امتیاز صاحب پاگل ہو رہے تھے۔ دن بھر
اندر باہر کے چکر لگایا کرتے۔ ساری ساری رات دروازے کے سامنے کرسی
بچھائے بیٹھے رہتے۔

"یہ جنون انھیں کیوں ہو گیا ہے۔ اشفاق بھائی! —" بیگم امتیاز پریشان
تھیں۔

"بھابی یہ میری غلطی ہے۔ اپنے دل کا لاوا ان کے سامنے کیا نکال پھینکا کہ
امتیاز کو اتار دیا ایک دلدل میں —!" اور پھر انھوں نے رازداری اور پردہ پوشی
کے وعدے لے کر ساری داستان بیگم امتیاز کو سنا دی —

وہ تو یوں مبہوت ہوئیں کہ زیدی صاحب ڈر گئے کہیں یہ بھی بے ہوش نہ ہو جائیں
اور جب وہ بھی دم بخود رہ گئیں تو یہ راز بیگم زیدی پر بھی کھل گیا۔ اور پھر کسی
سے بھی چھپا نہ رہ گیا۔

صالحہ نے دل تھام لیا۔ میرے اللہ۔ کیا یہ سچ ہے۔ ایک موہوم سی امید نے
اس کے دل کے نہاں خانوں میں چراغاں سا کر دیا۔

حافظ جی نے ساری کیفیت زمان کو لکھ بھیجی۔

"امتیاز دعا کیجیے۔ کیا بتاؤں کہ دل میں [illegible] ہو گئی ہے! — اب [illegible]

گئے تھے۔ اپنے بیٹے کی تلاش میں انھوں نے کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے، مگر ناکام رہے۔

اس جگر خراش صدمہ نے ان کے قلب و دماغ کی ساری توانائی نچوڑ لی۔ بیوی سے منہ چھپاتے۔ دوست احباب سے کتراتے۔ زیدی صاحب سے بھی ملنا جلنا پسند نہ کرتے۔ اور ایک دن انھوں نے سوتے ہی سوتے جنت کی راہ لی۔!!

عجیب سانحہ بیگم امتیاز پر پڑا تھا۔ وہ زندہ درگور تھیں۔ شوہر ختم ہوا۔ بیٹا سات سمندر پار تھا۔ باپ کے مرنے کی خبر بھی جسے نہ تھی!! ۔ وہ یقین کرنے پر تیار نہیں تھیں کہ سچ مچ امتیاز صاحب ختم ہو گئے تھے۔

اُن کی وفات کا تیسرا دن تھا۔ امتیاز صاحب کی بہن اور اُن کی بچی ماریہ [illegible] آئے۔ بیگم امتیاز ان سب کے سامنے خون کے آنسو روتی رہتیں۔ امتیاز صاحب کی بہن کا حال تباہ تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر روتیں۔ ماریہ سہمی ہوئی خوفزدہ سی ایک ایک کو دیکھتی رہی!۔

"فرحان سے کیا کہوں گی۔" بیگم امتیاز کے لبوں سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ "میرا بچہ اتنی دور چلا گیا ہے۔ اسے پتہ نہیں کہ یہاں کیا ہوا۔ وہ آئے گا۔ وہ پوچھے گا کہ ممی میرے ڈیڈی کہاں ہیں۔ وہ کہاں ہیں۔ میں اس کو کیا جواب دوں گی۔ کیسے کہوں گی کہ ممی۔ میرے بچے تیرے ڈیڈی تو تیری راہ تکتے تکتے چلے گئے فرحان۔ میرے فرحان [illegible] تیرے [illegible] کر گئے۔"

وہ روتی رہیں۔ سب روتے رہتے تھے۔

"بھابی۔ یک بیک بھیا کو کیا ہو گیا۔" امتیاز صاحب کی بہن نے پوچھا۔ "[illegible] کوئی وجہ بیان کرو ناں بہن۔" وہ اس قدر بدحال [illegible] وجود [illegible] پریشان [illegible] اُن [illegible]

غمگسار بیگم زیدی تھیں۔ جن کا پہلے ہی حال تباہ تھا۔ معلوم نہیں کون کون سے احساس انھیں نادم و منفعل رکھتے تھے۔ ایک چپ انہیں بھی لگی تھی!۔

بیگم امتیاز کو غموں نے کچل ڈالا۔ صدہا سال کے بیمار کی طرح وہ بستر پر گر پڑیں نہ انھیں اب یادالہٰی میں فروا رتا تھا نہ لوگوں کی صحبت میں نہ تنہائی میں۔ کہیں نہیں۔ ۔ جسد بے روح تھیں۔ سانس کی ڈوری کمزور تھی!۔ آنکھوں میں مدھم سی روشنی تھی فرمان کے دید کی۔

فرمان ابھی تک اس حادثے سے بے خبر تھا جو اس پر گزر گیا تھا۔ اس کے بے حد دلچسپ خط آتے۔ بہت سارے خط ایک ساتھ ڈالتا۔ اپنی ماں کے نام۔ پھر صالحہ کے نام اور پھر عائشہ کو۔ اس کے خط پڑھ کر بیگم امتیاز کی حالت غیر ہو جاتی!۔۔۔۔

"ممی۔ میں یہاں ہر طرح آرام سے ہوں۔ آپ اپنا خیال رکھئے۔ میں ہاں آکر آپ سے آپ ہی کو لوں گا۔ ڈیڈی سے کہئے کہ شام کی تیز سردیوں میں برآمدے میں نہ بیٹھیں۔ انھیں یوں بھی نزلہ ہو جایا کرتا ہے۔ ممی میں اتنی محنت کر رہا ہوں۔ اس قدر تیزی سے تعلیم کے مراحل طے کر رہا ہوں جیسے اپالو ۱۱ چاند کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ممی یہ مدت بہت کم ہے ڈیڈی کے دوست مسٹر جلال میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ممی مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے۔ ڈیڈی کو سلام کہئے۔

عائشہ کو وہ خط میں بھی چھیڑنے سے باز نہ آتا۔

'دیکھئے میں نے باقاعدہ اللہ میاں سے دوستی بڑھا رکھی ہے جی ہاں پردیس کو معاملہ ہے۔ اللہ میاں خفا ہو جائیں تو پھر کون سر پہ ہاتھ رکھے گا!۔ آپ کی نصیحتوں کا طومار ملا۔ اگر آپ نے ایسا ہی نصیحتیں جاری رکھیں تو انشاءاللہ میں بہت جلد ایک پہنچا ہوا ولی اللہ بن جاؤں گا۔

میرے بھیا ملے کہ نہیں؟ ۔ اُن کی تلاش جاری رکھئے ۔ آپ کی پڑھائی
کا کیا حال ہے...... مطمئن رہئے ۔ یہاں کی کسی لڑکی سے میری
دوستی نہیں ـــ انگوٹھی نہ اتارئیے گا ۔ ایک پارسل بھیج رہا ہوں ۔
بتائیے کہ اس میں کیا کیا ہے؟ ـــ

وہ زار و قطار رونے لگی تھی ۔ فرمان ـــ تم نہیں جانتے تم پر کیا قیامت گزر گئی ہے؟ ۔ اگر تم گھر کا نقشہ دیکھو ۔ ہائے فرمان ـــ ممی کا دل تباہ ۔ اپنا یہ بڑھاپا چھا رہا ہے ۔ بابا جان نادم ہیں ۔ شفو بھیا کہیں نہیں ہے ۔ میں نے تعلیم کو خیر باد کہا دل نہیں لگتا ۔ ہائے ۔ فرمان تم جلدی لوٹ آؤ ۔ کچھ تو دل کو سکون ہو ۔ یہاں تو کتاب زندگی کے بڑے کتنے ورق الٹ گئے ۔

ماریہ اور اس کی امی بہت سیدھی سادی تھیں ۔ ماریہ ابھی چھوٹی ہی تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا ۔ اس کی امی نے بڑی کسمپرسی کی زندگی بسر کی تھی ۔ گاؤں میں ایک چھوٹا مکان تھا جس کی آمدنی سے بسر ہوتی تھی ۔ وہ شاہانہ طرز زندگی کی عادی نہیں تھیں ۔ نہ ہی انہیں یہ انداز راس آتے تھے ۔ وہ بہت خوش بخت اور خوش نما عورت تھیں ۔ ان کی بیٹی ماریہ بھی تھی سولہ سترہ سال کی معصوم سی لڑکی ۔ جو کبھی زبان سے نہیں بولتی تھی ۔ آنکھوں سے بولتی تھی ! ۔ وہ اتنی معصوم تھی اس کی معصومیت پر ترس آنے لگتا تھا ! ـــ اس کی شکل پہ بے کسی برستی تھی ! ۔ آنکھوں سے بے چارگی جھلکتی تھی ۔ پتلے پتلے لبوں پر خوشی کے افسانے مچلتے تھے ! ـــ دبلی پتلی نازک سی لڑکی تھی ۔ شہابی رنگت اور بادامی آنکھوں والی بے حد دلکش لڑکی ۔ عائشہ کو وہ بڑی اچھی لگی ۔ اور وہ بھی اس کی دوست ہوگئی ۔ ۔ رات کا اندھیرا تھا ۔ جب ماریہ اور عائشہ بیگم امتیاز کے پاس بیٹھی تھیں ۔ ماریہ نے اپنے ذہن کی گتھی کو کھولا اور سیدھے سادے طرز حیات کی سادگی تفصیل سے واقف کروا دی تھی ۔ اس

نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ یوں عائشہ سے گھل مل گئی جیسے مدتوں سے اسے جانتی ہو!"
اپنی ماں سے بڑھ کر وہ محنتی تھی!۔ حالانکہ نیلی کوٹھی میں ملازم بہت سے تھے،
لیکن وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں جٹی رہتی!۔
ماریہ کی امی کو وہ سب پھوپھی جان کہتے تھے۔ وہ بھی اپنی لڑکی کو کسی کام سے
منع نہیں کرتی تھیں۔ جیسے وہ احساس کمتری کے مارے یہ سمجھتی تھی کہ جو کچھ ماریہ کرتی
ہے۔ وہ اس کا فرض ہے!۔
اور پھوپھی جان بے چاری جوان بھائی کے غم سے نیم جاں تھیں وہ بس بیگم امتیاز
کی پٹی پکڑے بیٹھی رہتیں۔ طرح طرح سے ان کی دلدہی کرتیں۔ حالانکہ دکھ ان کو
بھی بے پناہ تھا۔ مگر وہ اُن کا رنج کم کرنے کی سبیل میں لگی رہتیں!۔
آہستہ آہستہ ماحول پر چھایا ہوا سوگوار کہر چھٹنے لگا۔ کب تک کوئی مرنے
والے کا سوگ مناتا!۔ بیگم امتیاز اگرچہ بیمار رہی تھیں مگر اپنے دور افتادہ بیٹے
کے لئے انھوں نے پھر سے زندگی کو آواز دی۔ اور از سر نو بیگم زیدی کے پاس
اٹھنے بیٹھنے لگیں۔

امتیاز صاحب کے ناگہانی انتقال نے حالات کو عجیب رنگ دے دیا تھا!۔
زیدی صاحب اپنے بھانجے کی بازیابی کے لئے کوشاں تھے!۔ صائمہ بدستور گم صم
تھی۔ وہ سب سے انتقام لینے کے بجائے مستورات سے پڑھنے میں جٹ گئی۔
عائشہ اور ماریہ کا زیادہ وقت سر جوڑے باتیں کرنے ہی میں گزرتا۔
عائشہ کو بہت زیادہ فکر تھی کہ جب کسی نہ کسی طرح فرمان تک یہ خبر پہونچے گی کہ اس
کے ڈیڈی ختم ہو چکے ہیں تب وہ کیا کرے گا؟! کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اتنی
دور فرمان کو یہ دلدوز خبر پہنچائے۔
"خدا کرے کہ وہ بے خبر ہی رہے۔" بیگم امتیاز کہتیں!۔ "بیٹی۔ تم لوگ بھی

اُسے نہ لکھنا۔ مجھ پر رحم کرو۔ ان کا ایک جوان بیٹا تو انہیں یوں داغ دے گیا کہ ہم سب کی زندگیوں کو بھی جیتی جاگتی موت بنا گیا۔ خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ کی موت کی خبر پاکر فرمان یہاں نہ آئے۔ اگر کسی غیر نے فرمان کو اطلاع دے دی تو میں اس کی تردید کر دوں گی۔ تم لوگ اُسے اچھی اچھی باتیں لکھ بھیجو۔ اُس کا دل بڑھاؤ۔ اُسے نصیحت کرو کہ وہ پڑھتے لکھتے اور یہاں کسی کو یاد نہ کرے۔ آہ! میں تو کیسی لٹی ــ"

باتیں کرتے کرتے اچانک ان کے دل میں ٹیس اٹھتی ــ وہ وہ بے چین ہو کر کہنے لگتیں۔ خدا نے کیسی تقدیر بنائی ہے۔ بیٹی بیاہی گئی۔ زندوں کو یوں اللہ میاں نے آنکھوں سے دور کر دیا ہے! ــ ہائے پھر میں کیوں زندہ ہوں؟ ــ ایک سہارا تھا۔ مضبوط اور اٹل سہارا ــ وہ یوں ختم ہو گیا۔ اُن کے بعد زندگی کیسی ہے؟ ــ"

"بہن ــ فرمان کی صورت دیکھو۔ تم یوں رو رو کر بے حال ہو جاؤ گی تو اس کا پوچھنے والا کون رہ جائے گا؟ ــ" بیگم زیدی سمجھاتیں۔

"بھابی ــ بلا بھیجئے فرمان کو ــ کیا ضروری ہے کہ وہ آپ سے دور رہ کر پڑھیں کیا یہاں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ نہیں ہے! ــ" بجو چچی جان کہتیں۔ مگر بیگم امتیاز کو یہ بھی منظور نہیں تھا! ــ تب سو ماں رونے کی غیرت سے دوچار رکھتیں۔

"نہیں ــ جب میں اس کی خوشیاں ملیامیٹ نہیں کروں گی!" وہ کہتیں!

سب اُن کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اب بھی پرانی محفلیں آراستہ ہوتیں۔ سب مل بیٹھتے۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں۔ سب ایک دوسرے سے نظریں چراتے۔ اُس بد نصیب بیٹے والی کو اُن دو لوگوں کی جدائی کا بہت زیادہ احساس تھا جو یک بیک اُن کے درمیان سے ہمیشہ کے لئے چلے گئے تھے! ــ

اللہ کی یہ وسیع و عریض دنیا جس کی وسعت و رفعت کی کوئی حد نہیں ہے۔ اُن لوگوں کے لئے بازی گاہ اطفال ہے۔ جو اسے فانی اور سراسر نمائشی سمجھتے ہیں نمائش۔ جو مقررہ مدت کے لئے اپنی تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ ہوتی ہے اور پھر اپنی تمام دلچسپیاں سمیٹ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ کتنا بڑا ہے۔ دنیا کا اسٹیج۔ کیسے کیسے انوکھے۔ دلخراش بھی، غمناک، دلدوز اور مسحور کن تماشے اس اسٹیج پہ ہوتے ہیں۔ کبھی جنگ تو کبھی رقص۔ کبھی یہاں نغمے گونجتے ہیں تو کبھی نوحے بلند ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی اپنا تماشہ دکھانے کے لئے یہاں قدم رکھتا ہے اور کوئی کھیل ختم کر کے رخصت ہو جاتا ہے!۔"

اور کتنے عجیب و غریب ہیں اس اسٹیج کے وہ گرین روم۔ جنہیں گھر کہا جاتا ہے جہاں تماشائی اور تماشبین اپنے اپنے کھیل کے آغاز کے لئے تیار ہوتے رہتے ہیں عجیب و غریب کلوک روم۔ نت نئی صورتوں کو اپنے اندر چھپائے رہتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا بجز خدا کے کس گھر میں اور اس کے گھر کے رہنے والوں پر شب و روز کی الٹ پھیر کے ساتھ ساتھ کیا گزرتی ہے۔ بڑا عجیب تر ہے وہ کھلونا۔ جسے قدرت نے اشرف المخلوقات کا خطاب دے کر زندگی کی سزا بھگتنے کو زمین پر اتار دکھا ہے اپنے زعم میں ہر طرح آزاد خود مختار ـــ اور در حقیقت ہر قسم کی پابندیوں میں جکڑا ہوا۔ نہ تو اس کا ہنسنا اس کے بس میں ہے نہ اس کو گریہ اس کے بس میں ـــ ایک قوی انجانے ہاتھ کے شکنجے میں کسا ہوا انسان ـــ جس کے دعوے بلند و عظیم لیکن بے بنیاد ہوتے ہیں!ـــ جو اپنی زندگی تک پر اختیار نہیں رکھتا۔ جسے یہ بھی

پتہ نہیں کہ وہ کب کس وقت اور کیسے مرے گا؟ —

عالیہ جو مسکراہٹوں کی آغوش میں پلی بڑھی تھی! — جسے پتہ نہیں تھا کہ غم کیا ہے اور دکھ کیا! — اس نے اب دیکھا کہ کیسے اور کیونکر ایک نوجوان کے پہاڑ ایسے جسم کو روندتا ہوا گزر جاتا ہے! — اپنے گھر کی تباہی، نینی کرشی کے گھر کی بے بسی اس سے دیکھی نہ جاتی! — اسے اپنے باپ پر غصہ آتا! — اور بیگم امتیاز پر بے پایاں ترس۔

زیدی صاحب اپنے دوست کی یاد میں بہت برباد ہو چکے تھے! — انھیں شفقت کا خیال تھا۔ جسے شرافت ہمسایہ کے خوف سے دربدر کر دیا تھا۔ صالحہ کا شباب انھیں خون کے آنسو رلاتا — وہ تو دیکھ رہے تھے۔ شمسہ بیگم نے سب ہی لٹے اور اولاد کو خدا کے حوالے کر دیا۔ اب کہیں کوئی نہیں تھا جو صالحہ کا ہاتھ تھام لیتا! اس کا حسن و شباب خاردار ٹہنی میں بلندی پر کھلا ہوا گلاب تھا۔ جسے کسی کے گلے کا ہار ہونے کی مسرت نصیب نہ ہو سکی تھی اور اب جس کی پژمردہ پتیاں ایک ایک کر کے زمین پر آ رہی تھیں۔

وہ اب بھی پڑھ رہی تھی! — ایم۔ اے کا آخری سال تھا۔ یونیورسٹی بھر میں کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکتی! — اساتذہ اس کے ذہن اور قلم کی تعریف کرتے تو زیدی صاحب کے قلب پر دھکا لگتا! — انھیں اب کوئی مسرت نہ ہوتی! — مگر وہ دکھانے کو صالحہ کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کرتے رہتے! —

"ابا جان — میں نے سنا ہے کہ حکومت مجھے اپنی طرف سے یورپ بھیجے گا! — ریسرچ کے لئے — ابا جان — خدا نے آپ کی آرزو پوری کر دی — مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے معیار پر پوری اتری —!" ایک دن صالحہ نے کہا۔ زیدی صاحب کو ایسا لگا جیسے وہ برف کے تیر ان کے دل پر برسا رہی ہو۔ انھوں نے اس کے چہرے

کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کی۔ سر جھکا کر پیشانی سے پسینہ پونچھا اور پھیکی مسکراہٹ سے بولے۔

"ہاں بیٹی۔ بڑی خوشی کی بات ہے! ۔۔۔"

"بہت خوشی کی بات ہے باباجان!" صالحہ نے دہرایا۔ اور ان کے سامنے سے ہٹ گئی۔

"کتنی خوشی کی بات ہے!" بیگم زیدی نے سسک کر کہا: "کل کو ہم لوگ قبر میں پڑے ہوں گے۔ جوان بیٹی یورپ کے روشن فضاؤں میں اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرتی ہو گی۔ وہ تو فرشتہ ہے۔ نہ تو اس کا دل ہے نہ نفس ہے۔ نہ وہ کسی مرد کے قریب جا سکتی ہے۔ نہ کوئی مرد اس کے پاس آ سکتا ہے۔ اخلاق، تہذیب، شرافت اور نسائیت اس پر ختم ہے۔ اس کا قدم کبھی ڈگمگا نہیں سکتا! بس وہ پڑھ پڑھ کر بوڑھی ہو گی۔ اور ایک دن وہ بھی آئے گا جب وہ اس تنہا دنیا میں یوں اکیلی ہو گی۔ جیسے بیابان میں ببول۔ جس کا کوئی سایہ نہیں جس پر کسی کی چھاؤں نہیں۔ تب وہ دور اندیش باپ کو دامن پھیلا کر دعائیں دے گی کہ کتنا سنہرا مستقبل اس کے لیئے تیار کر گیا کہ خدا دشمن کی لڑکی کا بھی یہ حشر نہ کرے!!"

زیدی صاحب کا یہ حال تھا جیسے کسی نے سر بازار عریاں کر دیا ہو۔ جواب میں انھوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ ایک آہ بھری اور سر جھکا کر کچھ سوچنے لگے۔

"اب بھی کچھ نہیں گیا۔ آپ ناگیور جائیے۔ بھائی جان سے صاف صفائی ہو جائے تو پھر آگے کی راہیں کھل جائیں گی۔ اب تو عائشہ کی بھی فکر ہے۔ کیا اسے بھی یورپ بھیجئے گا۔ اگر کہئے تو میں خود خط لکھ کر بھائی صاحب کو یہاں بلاؤں؟! ۔۔۔"

"تمہاری مرضی۔ بیگم! ۔ میں تو پاگل ہو چکا! ۔۔۔"

شمسہ بیگم نے بیگم امتیاز کے مشورہ سے خط لکھا اور زوار حسین صاحب کو بھجوا دیا!

کامل ڈیڑھ دو سال سے ان کی خیر خبر کسی کو معلوم نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی شمیم بیگم کو یقین تھا کہ وہ ممکن مدد سے دریغ نہیں کریں گے!۔

اگلے دن یونیورسٹی میں کانووکیشن تھا!۔صالحہ کے ساتھ عائشہ بھی اپنی سند لینے چلی گئی!۔بہت دن بعد عائشہ نے اتنے بڑے اجتماع کو دیکھا تھا نئی نئی شکلیں نظر آئیں۔ صالحہ اپنے وزن و وقار میں گم الگ تھلگ جا بیٹھی۔ بہت جلد ہی اسے اس کے جاننے والوں نے گھیر لیا۔

عائشہ دوسری قطار میں لڑکیوں کے ساتھ تھی!۔ اور بے دلی سے سر گھما گھما کر گرد و پیش کے اژدحام کو دیکھ رہی تھی!۔

"ہیلو!" اچانک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا!۔

وہ چونک کر پلٹی۔ اس کے سامنے ایک بہت خوبرو اور خوبصورت انسان کھڑا تھا!۔عائشہ سے اس کی نظریں ملیں۔ اور وہ بے حد شرمسار نظر آنے لگا!۔ اس نے اپنی پلکیں جھکالیں۔

"معاف کیجئے گا۔ میں سمجھا رینا ہے۔ وہ بھی اسی رنگ کا لباس پہنے تھی۔ مجھے بہت شرمندگی ہے۔ معاف کر دیجئے!"

"معاف کر دیا۔" عائشہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کتنا خوبصورت ہے یقینا پڑھا لکھا ہوگا۔ پھر اتنی بوکھلاہٹ۔ کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔"

بہت بہت شکریہ۔" وہ کھسیانے انداز میں ہنسا اور اس کے خوشنما دانت چمکنے لگے۔

"رینا مجھے ڈھونڈتی ہوگی۔ میری چھوٹی بہن ہے۔ مجھے راجندر کہتے ہیں!۔ کیا آپ سند لینے آئی ہیں!۔"

جی ہاں!۔" عائشہ نے کہا۔ اور ڈائس پر دیکھنے لگی۔ جہاں ایک بڑے

سرمایہ دار تشریف لے آئے تھے۔ جنھیں عائشہ جانتی تھی کہ بالکل جاہل ہیں، ڈھنگ سے اپنے دستخط بھی نہیں کر سکتے۔ مگر جو اپنے مالدار ہاتھوں سے علم و ادب کی تقسیم کریں گے، دولت ۔۔۔ جو علم پر حاوی ہو جاتی ہے! ۔ ایک سرد آہ عائشہ کے لبوں سے نکلی۔

بھیا کہاں کھو گئے تھے! ۔" اچانک عائشہ نے اپنے پیچھے ایک سُریلی آواز سُنی۔

تمہی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا! ۔" راجندر نے کہا۔ بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ اس کی آواز بھی بہت دلکش اور بچپن کی سادگی لئے ہوئے تھی۔ ویسے اس کی عمر کا اندازہ عائشہ نے پچیس تیس سال کے اندر لگایا تھا! ۔

اُن محترمہ پر تمہارا دھوکا ہوا تھا۔ بڑی بے تکلفی سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھیں مخاطب کیا۔" راجندر نے آہستہ سے کہا۔" پتہ نہیں کیا سوچتی ہوں گی! ۔"

اتنے میں تقسیم اسناد کی مبارک رسم کا آغاز ہوا۔ اور جاہل ہاتھ علم بانٹنے لگے! صالحہ اور عائشہ کا نمبر بھی آیا۔ راجندر اور رینا بھی سندیں لائے۔ مگر عائشہ بیزار ہو رہی تھی۔ اسے اس قسم کی تقریبات سے رتی بھر دلچسپی نہیں تھی! ۔

پھر اس کے پاس صالحہ آئی۔ بڑی اداس اور سنجیدہ لگ رہی تھی! ۔

"ہم اپنی ڈگریوں کو تعویذ کی طرح گلے میں ڈال لیں گے باجی! ۔" عائشہ بولی۔

"بیوقوف۔ ہر جگہ ڈھنڈورہ پیٹتی پھرو گی کہ تم اپنی زندگی کا نصب العین کچھ اور چاہتی ہو؟ ۔" صالحہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہیلو مس زیدی۔ مبارک! ۔" دفعتاً اس نے رینا کی آواز سنی۔

شکریہ! ۔" صالحہ نے بڑی دلپذیر مسکراہٹ کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا۔

"بھیا آپ کے احسان مند ہیں ۔" رینا نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا تھا۔ اور بے حد سادگی سے کہہ رہی تھی! ۔" آپ کی ایک کہانی ان کے پرچہ میں شائع ہوئی تھی۔ جو تقریباً بھیا سے۔ لگ بھگ ڈیڑھ سو جدید اردو کے افسانہ

ہوا تھا۔ آپ ڈائریکٹ کیوں نہیں بھیجا کرتیں کہانی دیتیں ؟ مس زیدی ؟؟ —

راجندر بھی ان کے قریب کھڑا تھا معصوم چہرہ۔ سادہ سی مسکراہٹ۔ شاید وہ اپنے بے پناہ حسن سے بے خبر تھا ورنہ بے حد مغرور ہوتا! —

صالحہ نے ہنس کر اُسے دیکھا۔ اور وہ اس کی مطابقت میں فوراً ہنس پڑا۔ کسی وجہ کے بغیر — ! عائشہ کو ہنسی آگئی۔

"یہ عائشہ ہے۔ میری چھوٹی بہن !" صالحہ نے ان سے تعارف کرایا۔ اور مجبوراً عائشہ کو اُن دونوں سے ہاتھ ملانا پڑا۔

دھوپ بڑھ چلی تھی۔ موسم ناگوار تھا۔ ہال رفتہ رفتہ خالی ہونے لگا تھا! —

"اچھا۔ راجندر صاحب۔ اب اجازت دیجئے۔" صالحہ نے کہا "آپ سے مل کے خوشی ہوئی۔ اردو کہانیوں کو آپ ہی ہندی میں منتقل کرتے ہیں ؟! —"

"جی ہاں ! —" اس نے سر جھکا کر کہا۔ جیسے ہندی میں منتقل کرنا جرم ہو "کبھی غریب خانے پر بھی تشریف لائیے۔ مس زیدی آپ بھی۔ کہانی بھی لے لیجئے گا! —" صالحہ نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ سب اس کے پیچھے چلے اور پھر اس کی گاڑی تک دونوں کو پہنچا کر رخصت ہوئے۔

اچانک عائشہ کا خون خشک ہو گیا۔ پروفیسر رازی ان کی طرف لپکا آ رہا تھا! — پھر چند قدم کا فاصلہ اس نے دوڑ کر پورا کیا۔ صالحہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات چھیل گئے — مگر اس نے رسمی سلام کر کے خیریت پوچھ ہی لی !!"

"زندگی گزار رہا ہوں —" اس نے ایک دبی ہوئی آہ بھر کر کہا۔ عائشہ کی زندگی میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو گی۔ پھر بھی معنی خیز انداز میں سنجیدگی سے بولا۔

"مس زیدی۔ مجھے خوشی ہے۔ ترقیاں، کامیابیاں اور شہرت آپ کے قدم بقدم رہی ہے۔ زندگی کی ایک روشن اور واضح راہ آپ کے سامنے ہے۔ خدا کرے

کہ آپ ہمیشہ کامران اور سرخرو رہیں۔ یہ تو میری ہی تقدیر میں اندھیرے لکھے تھے کوئی راستہ واضح نہیں۔ زندگی کیا ہے؟ ۔۔ اے زگ زیگ پاتھ آف فیٹ! ۔۔ کیا کچھ میں نے نہیں سوچا تھا مگر پروفیسر صاحب نے منظور نہیں کیا۔ آج کل آپ کیا کر رہی ہیں؟ ۔۔"

"ایم۔ اے ۔" صالحہ نے زیرِ لب کہا اور سر جھکا کر سبزہ کو دیکھنے لگی۔

"اچھا۔ تو اب اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!" اُس نے سرخم کر کے کہا اور ایک الوداعی نظر صالحہ پر ڈال کر چلا گیا۔

"بے چارے!" عائشہ نے کہا۔

"بے چارے ۔" صالحہ طنزیہ ہنس کر بولی "مرد کبھی بے چارے نہیں ہوتے۔ عاشی! انھیں ہزاروں صالحہ مل جائیں گی۔ مگر بے چاری صالحہ جو مانگتی ہے وہ اسے کبھی نہیں ملے گا۔ عاشی۔ یہ ترقی۔ کامیابی۔ شہرت بے بنیاد۔ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ بچہ اگر چاند کے لئے مچلتا ہے تو اسے آئینہ میں چاند کا عکس دکھا کر بہلا دیا جاتا ہے۔" پھر وہ خالی الذہنی کے انداز میں بڑبڑائی "چاند۔ جیسے رہ ندا گیا۔ وہ کبھی کسی کی مٹھی میں نہیں آتا"

"باجی۔ شکر اپنی دیکھئے" عائشہ نے کہا "ایک آپ ہیں۔ جنہیں اتنی ناموری حاصل ہے۔ اور پھر بھی آپ تہی دامن ہیں۔ ایک میں ہوں۔ بیکار۔ جاہل۔ گمنام!"

"گمنام؟! ۔۔" صالحہ کے لبوں سے سسکی نکل گئی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا۔ "تم ۔ تم بہت اچھی ہو۔ عاشی۔۔ بے خبر۔ بے فکر۔ اچھی۔ چلو چلیں! ۔۔"

"کیا آج ہی سب ملنے والے مل جائیں گے!؟" دفعتہً عائشہ ناگوار لب و لہجے میں بڑبڑائی اور پھر صالحہ کو ٹہوکا دے کر بولی ۔۔ "او ہو ۔۔ ناظمہ باجی۔ بہت دنوں بعد ملیں!"

"ناظمہ۔ تم؟ ۔۔" صالحہ نے خوش ہو کر کہا "کہاں تھیں؟ چشم بددور۔ پہلے سے

بدل ہی گئیں ۔"

وہ بڑے فخریہ انداز میں ہنسنے لگی ۔" زندگی میں کچھ کر کے دکھایا ہے ۔ ! بھلا کیسے نہ بدلوں گی ۔ اللہ صالحہ تمہیں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ۔ بی ۔ اے کے بعد ایسے جدا ہوئے کہ پھر ملے ہی نہیں ۔ آؤ نا ادھر لان پر بیٹھ کر باتیں کریں ۔ پھر تم کہاں ۔ میں کہاں؟

"کیوں ۔ اب کیا ہوا ۔ ملتے رہیں گے !" صالحہ اس کے ساتھ سبزے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی ۔ پھر اطمینان سے سایہ دار جگہ پر بیٹھ کر نائلہ نے ایک تھکان زدہ آہ بھری

"ارے ۔ اب کہاں ملنا ہوتا ہے ۔ میں اسی ہفتہ جا رہی ہوں ۔ کینیڈا ۔" وہ " وہیں انجینئر ہیں !"

"اچھا؟ ۔ تم نے شادی بھی کر لی ؟ ۔"

"امی کا انتقال ہو گیا ۔ صالحہ ۔ ابا معذور تھے ۔ کیا کرتے ۔ چچا نے جھٹ پٹ کہیں پیغام لگا دیا اور شادی بھی کر دی ۔ چھ مہینے پہلے تک تو یہیں تھے ۔ پچھلے دسمبر میں سرکاری وظیفے پر کینیڈا گئے ہیں ۔ تمہارے شفقت حسین صاحب بھی ہم سفر تھے ۔ کیا وہ بھی سرکار کی طرف سے گئے ہیں ؟ ۔"

"شفقت حسین صاحب ؟!" ۔ صالحہ کے ہاتھ سے سند چھوٹ گئی ۔ اور وہ حیران نگاہوں سے نائلہ کو دیکھنے لگی ۔ مانو دل اچھل کر حلق میں آ گیا ۔

"شفقت بھی کینیڈا گئے ہیں ؟" ۔ اس کے لبوں سے گھبرائی ہوئی آواز میں نکلا ۔

"کیا بات ہے ۔ تم یوں اس قدر حیران اور بد حواس کیوں نظر آ رہی ہو ؟" نائلہ بھی متحیر ہو کر بولی "کیا ان کا کینیڈا جانا بہت تعجب خیز بات ہے ؟! ۔"

"نہیں تو ۔" صالحہ سنبھل گئی ۔ اور زبردستی مسکرا کر بولی " در اصل ۔ وہ ہم سے کچھ خفا ہو کر چلے گئے تھے ۔ کوئی انہیں رخصت کرنے نہیں گیا تھا نا اس لیے !"

"ہاں شکیل اور پرویز ان سے ملنے بھی گئے تھے ۔" نائلہ نے کہا ۔ مگر وہ کچھ پوچھ نہ سکی

اُن سے۔ پوچھتی بھی کیسے ۔ وہ تو مجھے پہچانتے نہیں تھے ۔ ہزاروں مسافر روز آتے جاتے ہیں ۔ اگر وہ اُلٹ کر مجھ ہی سے پوچھ بیٹھتے کہ محترمہ آپ کون خدائی فوجدار ہیں تو خواہ مخواہ ارشاد کو بھی شک ہوتا ! ۔"

"آپ کے سامنے وہ ہوائی جہاز میں بیٹھے تھے ۔ آپ کے سامنے ہوائی جہاز اڑا تھا !"

عائشہ نے پوچھا۔ ویسے اس کے دل کی حالت کا اندازہ یا تو اسے تھا یا خدا کو ۔

نائلہ اس کے بچپن پر ہنس پڑی "احمق لڑکی ۔ اگر وہ جہاز کے اندر نہ بیٹھتے تو کیا جہاز کے چھت پر سوار ہو جاتے ۔ اب یہ بھی قسم کھا کر کہوں کہ ہوائی جہاز میری ان ہی آنکھوں کے سامنے اڑا تھا اور پلک جھپکتے میں بادلوں کے اندر گم ہو گیا تھا ۔ اس کی گونج البتہ دیر تک میرے کانوں میں بسی رہی تھی ! ۔"

صالحہ زانو پر ٹھوڑی ٹیکے بے تعلق انداز میں سبزہ نوچ نوچ کر پھینک رہی تھی ۔

"چائے پیو گی ؟ ۔" اچانک نائلہ نے پوچھا ۔

"نہیں ۔ نائلہ ۔" دیر بعد صالحہ نے سر اٹھایا اور بہ دقت تمام مسکرا کر کہا "شکریہ تم سے ملاقات ہو گئی ۔ بس نئی زندگی ملی ۔ سچ سچ ۔ پھر تم کہاں اور میں کہاں ؟ ۔"

"تم بھی تو شاید لندن یا جرمنی کہیں جا رہی ہو ؟ ۔ ایک دفعہ کسی نے تذکرہ کیا تھا !"

نائلہ نے کہا ۔

"پتہ نہیں ابھی کچھ طے نہیں ہوا ۔۔۔"

پھر نائلہ بھی اٹھ گئی اور بڑی گرمجوشی سے مل کر چلی گئی ۔ صالحہ عائشہ سے کچھ کہے بغیر گاڑی کی طرف بڑھ گئی ۔۔۔

راستے میں عائشہ نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر صالحہ نے روک دیا "جو شخص ایسا بے مروت ہو جائے کہ نہ اپنی خیر خبر دوسروں کو دینا چاہے اور نہ اُن کی موت زندگی سے کوئی واسطہ باقی رکھے ۔ اس کا تذکرہ کیا ۔ عائشہ !

باجی آپ کو اُن سے محبت تھی؟" بے ساختہ اس کے لبوں سے نکل گیا۔

"خاموش رہو!"

زیدی صاحب کے تعجب کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا جب انھوں نے عائشہ سے سنا کہ شفقت بے نشان زگمان کینیڈا پہنچ گئے!۔ اُن کے تجربوں بھرے چہرے پر چند دہائی سال کے طویل عرصہ بعد مسکراہٹ نظر آئی۔

اشفاق بھائی!" بیگم امتیاز نے بڑی بے تابی سے کہا "خدا کے واسطے آپ دونوں بچیوں کو بلا لیجئے۔ میں اندر ہی اندر بیٹھی جاتی ہوں۔ مجھے امید نہیں ہے کہ میں اپنے بیٹوں کی صورت زندگی میں دیکھوں گی۔ دونوں کو تار بھیجیے وہ فوراً آئیں۔"

بڑھاپے کے تذکرے سے اب تو مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔ جھٹ پٹ وہ سمجھ جس سے ڈوبتی کان!" بیگم زیدی نے کہا "میری بھی یہی رائے ہے۔ شفقت اور فرحان دونوں کو بلوائیے۔"

بیگم امتیاز نے ایسی بے چارگی سے خدا کا واسطہ دیا کہ زیدی صاحب کچھ نہ بول سکے۔ اقرار کر لیا کہ دونوں بھانجوں کو کیبل دے دیں گے!۔

"ایئر انڈیا کے ایجنٹ سے شفقت حسین کا پتہ معلوم کرنا دشوار نہیں تھا!۔ اسی دن زیدی صاحب نے یونیورسٹی کے سربراہ زندہ عہدہ دار کی طرف سے کیبل دیا کہ وہ فوراً واپس آجائیں۔ دوسرا تار فرحان کو دے دیا۔ اور گھر والوں کے ساتھ ساتھ خود بھی بڑی بے صبری سے اُن کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ ان پر بھی تو زمانہ نے بڑا گہرا اور رنجیدہ اثر ڈالا تھا۔ سر سفید ہو چکا تھا۔ چہرہ بدل گیا تھا!۔ وظیفہ کے دن قریب تھے۔ جیسے لوہے کو زنگ راکھ کر کے رکھ دیتا ہے اسی طرح ان کے فولادی اعصاب کو دُکھ کے زنگ نے کمزور کر دیا تھا۔ وہ خود سے ہار چکے تھے!۔

صالحہ سوچتی تھی کہ غیر متوقع طور پر جب شفقت کو رجسٹرار صاحب کا کیبل ملے گا تو وہ

کیا سوچیں گے اور کیا حال ہوگا اُن کا ؟ ــ آ ہ ــ لطف بھی آتا اور وہ فکر مند بھی ہوجاتی ۔ کیا انوکھا اور خوشگوار انقلاب آجائے گا شفقت کی زندگی میں ــ !! مگر وہ اُن سے خفا تھی اور طے کر لیا تھا کہ حتی الامکان اُن سے نہیں ملے گی ۔!

اس عرصہ میں اس کے پاس راجندر اور اس کی بہن رینا کی آمدورفت بہت بڑھ گئی تھی ۔ عقیدت مند تھا وہ صالحہ کا ۔ اور دل میں پوشیدہ حسرت رہتی تھی ۔ عائشہ کے دید کی ۔ وہ چونکہ ان کا ہم مذہب نہیں تھا ! ــ عائشہ گھنٹوں اس سے اور رینا سے باتیں کیا کرتیں ــ دونوں بہن بھائی تنہا رہتے تھے ۔ رینا کی شادی راے سے ہو چکی تھی ۔ وہ کسی کمپنی کا ٹریولنگ ایجنٹ تھا ۔ جب تک ٹور پہ رہتا ۔ رینا بلا ناغہ عائشہ سے ملنے آتی ۔ اور جب وہ واپس آجاتا تب اکیلا راجندر ہی آتا ! ــ اس عرصہ میں دونوں بہن بھائی سب سے بے تکلف ہوگئے تھے ! ــ

عائشہ کو حیرت ہوتی ۔ راجندر اٹھائیس تیس کے لگ بھگ تھا ۔ [illegible] تھا ۔ مگر بے پناہ سیدھا سادا ۔ اس نے نہ اپنے غیر معمولی حسن کی خبر تھی نہ امارت نہ مرتبہ کی ۔ حتیٰ کہ وہ مذہب کے تفرقہ سے بھی بے نیاز تھا ! ــ اتنی سادگی سے باتیں کرتا ۔ سب کے ساتھ کھانا کھاتا ! ــ حتیٰ کہ دکھ سکھ میں بھی کام آتا ۔ اور پھر رفتہ رفتہ گھر کے تمام حالات وہ بھی جان گیا ۔ اور اب یہ تماشہ تھا کہ وہ بھی ذارن سے آنے والوں کا منتظر تھا ۔ اس کے تمام گھریلو حالات بیگم زیدی کو معلوم تھے ۔ اُن سے بھی وہ باتیں کرنے بیٹھ جاتا !

ایک دن اس نے اُن سے کہا تھا " میں نہیں سمجھتا کہ جو تکلیف میری پیدائش پر میری ماں کو ہوئی تھی وہی تکلیف آپ کو نہیں ہوئی تھی ۔ جنم کا درد رنگ نسل قومیت اور مذہب سے بالاتر ہے ۔ اماں ! پھر میں آپ کا بیٹا کیوں نہیں بن سکتا ۔ کیوں نہیں میں بھی آپ کو امی کہہ کر پکار سکتا ۔ کیوں میں ایک ماں کا پیار کبھی ترسا !

ترستا ہوں، کانپتا ہوں؟"

بیگم زیدی نے مسکرا کر سوچا۔ یہ تو خوب رنگ لائے مگر اُس سے یہی بولیں: "ہاں بیٹا ضرور پکارو۔ عبد و معبود کی طرح ماں اور بیٹے کا بھی ایک رشتہ ہے۔ جس پر لوگ انگلیاں نہیں اٹھا سکتے۔"

"آپ ہمارے یہاں کھاتے پیتے ہیں۔ آپ کے کنبہ برادری والے اعتراض نہیں کرتے؟" عائشہ نے پوچھا۔

وہ بڑی خوبصورتی سے ہنسنے لگا! "کھانا پینا۔؟ اعتقاد اور مذہب کا تعلق روح سے ہے۔ جسم سے نہیں! — میں ان چیزوں کو نہیں مانتا! — میں جب مرجاؤں گا تو ہو سکتا ہے کہ پتاجی کی طرح جلا دیا جاؤں۔ تمام عمر کا کھانا پانی جو میری رگوں میں جذب ہے وہ بھی جل جائے گا۔ لیکن میری روح جو نکھری ستھری بے داغ ہے۔ جس سے مسلمان کا کھانا چھوٹا ہوا نہیں ہے۔ وہ تو بے داغ ہی خدا کے پاس پہنچے گی! —"

"آپ کے عقیدے ایسے بے لوث ہیں تو پھر آپ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟" بھولی بھالی ماریہ بول پڑی۔

"ہائیں۔ بیوقوف۔ چپ رہو! —" عائشہ گھبرا گئی۔ راجندر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا: "آپ کا مطلب ہے کہ میں رام کو رحیم کہوں۔ مگر ہونٹوں ہی سے اقرار کرنے میں کیا بات ہوتی ہے؟ — میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے! —"

"ویسے آپ کہئے تو میں اب کی رمضان مبارک میں روزے رکھوں گا! —"

"ماریہ! —" پھوپھی جان نے آہستے سے جھڑک دیا: "تم ہر ایک سے فضول باتیں مت کیا کرو۔ ہزار سر پیٹا مگر اس لڑکی کو عقل نہیں آتی —"

ماریہ کے چہرے پر شرمندگی کے آثار پھیل گئے۔ راجندر نے اس کی ندامت کم کردی۔

"ماریہ بہن۔ آپ نے پڑھا ہوگا۔ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا لہٰذا اماں جی کی خفگی کا اثر ہم پر نہیں پڑنا چاہیے!۔۔ ہم آپ بدستور دوست رہیں گے!۔۔"

بیگم امتیاز کی یہ کیفیت تھی جیسے آنکھوں میں جان اٹکی ہو۔ صبح سے شام تک دروازے پر نگاہیں گڑوئے رکھتیں آنچل سے پلکیں پونچھتیں اور روئی روئی آوازیں دن بھر میں کم و بیش بیسوں بار کہتیں۔

"میرے اللہ۔ کیا تو چاہتا ہے کہ بس دروازہ کھلے اور دونوں آجائیں۔"

خدا خدا کرکے ایک دونوں کے نفس سے شفقت کا اور پھر فرمان کا تار پہنچا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی موجودگی اور روانگی سے بے خبر اپنے اپنے مقام سے نکل چکے تھے!۔ بیگم امتیاز کی فرطِ مسرت سے عجیب حالت ہوگئی۔ روتی بھی رہتیں مسکراتی بھی رہی تھیں۔

"شمسہ!۔ کیسے یقین آئے کہ شفقت کو؟۔ وہ میرا بچہ نکلا۔ اللہ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا۔ میں اُسے یوں دربدر نہ ہونے دیتی۔ یا اللہ۔ میں فرمان کو بھی اتنے برسوں بعد دیکھوں گی۔ بہن۔ کوئی تدبیر بتاؤ۔ میرا کلیجہ کانپتا ہے۔ میں زبان سے کیسے کہوں گی کہ وہ۔۔ بے سہارا یتیم ہو چکا ہے اب"

اُن کے جذبات کی آندھیاں تند و تیز تھیں۔ جس صبح وہ آنے والا تھا۔ وہ ساری رات بیقرار رہی تھیں۔ رہ رہ کر گھڑی دیکھتیں۔ اور پھر بیچ آخذ بجے انھوں نے کھلبلی مچادی۔

"اشفاق بھائی۔ خدا کے لئے اب جائیے۔۔ اُسے لے آئیے۔ اگر میرے دل

میں طاقت ہوتی تو میں خود جاکر اُسے لے آتی !"

مادیہ نے ناشتہ تیار کر دیا اور زیدی صاحب بے چارے جو فرمان کے استقبال کے لیئے ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے ۔ بدقت تمام خود کو آمادہ کر سکے !

" زہرہ بہن ۔ تم اپنے آپ کو اس قابل تو بناؤ کہ فرمان سے مل سکو ۔" انھوں نے کہا ۔" خدا کی پناہ ۔ وہ تو تمھیں پوست استخوان دیکھے گا ! "

"وہ آجائے بس میں پھر سے زندہ ہو جاؤں گی !" وہ مسکرائیں ۔ اور دروازے کے سامنے کرسی کھینچ کر آ بیٹھیں ۔

پھر اپنا کام ختم کر کے سب ہی اُدھر آ گئے ۔ لگ بھگ دس بجنے والے تھے اب بیگم امتیاز کے چہرے پر اضطراب کے سائے منڈلانے لگے تھے بس وہ ٹکٹکی باندھے پھاٹک کی طرف دیکھ رہی تھیں ۔ جیسے ہی فرمان برآمدے میں آیا انھوں نے اپنی باہیں پھیلا دیں ۔ اُن کا بچھڑا ہوا بیٹا اُن کی باہوں میں سما گیا ۔

"ممی ۔۔ !" اُس نے چپکے کہا

"میرے بچے !" ممی نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر چوم لیا ۔ عائشہ زینے کے پاس کھڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی ! ۔۔ یہ بدنصیب کیا جانتا ! ۔ اسے کیا پتہ ۔ قدرت نے اس کے سر سے باپ کا سایہ ہٹا دیا تھا ۔ پھر وہ باری باری سب سے ملا ۔ انوت لپٹ گیا اور جب ان کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے تب وہ نجانے کیا سوچ کر آنسو پونچھنے لگیں ۔

"انوی ۔ آئیے !" اُس نے صالحہ کو دیکھ کر کہا اور بازو پھیلا دیئے ۔ صالحہ موم کی گڑیا کی طرح اس کے سینے سے لگ گئی ۔

عائشہ نے حیرت سے دیکھا ۔ ان دو ڈھائی برسوں میں وہ قد بدل کر رہ گیا تھا بلند بالا قد و قامت ۔ وجیہہ اور حسین چہرہ ۔ سیاہ وسعت میں زمی کی رنگت

نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کی رفتار میں عجیب سا دلکش اور شاہانہ ٹھہراؤ تھا کہیں اس کے چہرے میں سنجیدگی بھی پنہاں تھی۔ جس نے اس کی پوری شخصیت ہی کو پُرکشش کر دیا تھا۔"

پھر وہ صالحہ سے جدا ہوا تو اس کی کیفیت ہی بدلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔ لبوں پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

صالحہ اس کی پیشانی پر سے ننھی سی ایک لٹ ہٹاتی ہوئی بولی "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے فرحان۔ تم ہم میں واپس آ گئے۔ بڑے خوبصورت ہو گئے ہو۔ ایسی حسین تبدیلی کے متعلق تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

"میں تو سب کچھ بدلا ہوا دیکھ رہا ہوں۔" اس کی آواز میں بھاری پن جھلک رہا تھا۔ "ممی کیسی عجیب لگ رہی ہیں!۔ یہ سفید لباس۔ لٹا ہوا انداز۔ امی معلوم نہیں میرے دل کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ امی۔ میرے ڈیڈی کہاں ہیں آپ سب یہاں ہیں۔ وہ کہاں ہیں؟!" اور وہ ایک دوسرے کو دیکھنے اور نگاہیں چرانے لگے۔

"بابا جان؟۔ آپ سب خاموش ہیں۔" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "بولئے بابا جان.... مجھے ڈیڈی لینے نہیں آئے۔ وہ کہاں ہیں؟۔"

"بیٹے وہ یہاں نہیں ہیں!۔" زیدی صاحب نے لہجہ نرم بنا کر کہا "کوئی ہفتہ بھر پہلے وہ مدراس گئے تھے!۔ تین چار دن میں آ جائیں گے!۔"

فرحان نے ایک طویل سانس لی اور ہنس پڑا۔ "خدا کی پناہ۔ میں جانے کیا کیا سوچ گیا۔ خدا میرے ڈیڈی کو جلد واپس لائے۔!"

پھر وہاں مختلف باتیں چھڑ گئیں۔ ملازم چائے لے آئے۔ فرحان منہ ہاتھ

دھوکر پاس آبیٹھا۔ اس کا سامان بہت کچھ تھا۔ نجانے کیا کچھ سمیٹ لایا تھا۔ ہلکے پھلکے اور قیمتی تحفے اس نے نام بنام سب کو بانٹ دیئے۔

"بیٹے۔ تم آرام کر لیتے!" زیدی صاحب نے کہا۔

"باباجان۔ یہاں سے بھائی صاحب کے سلسلے میں جو مجھے لکھا گیا تھا۔ کیا وہ سب سچ ہے۔ خدا کی قسم۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ وہ سچ مچ میرے بھائی ہیں!" اس نے پیالی پرچ میں رکھی اور حیرت و تعجب سے بھرپور مستفسرانہ نظریں زیدی صاحب کے چہرے پر جمادیں۔

"ہاں!" انھوں نے سر جھکا کر پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "سب سچ ہے۔ اب وہ بھی تو کل یا پرسوں آرہے ہیں! ابھی رہے پردیس ہی میں تو بیٹے تھے!"

"جی ہاں۔ امی کے خط سے پتہ چلا تھا" اس نے کہا اور مسکرانے لگا "میں بہت خوش ہوں باباجان۔ ان سے ملنے کے لئے بے چین ہوں۔ میں تو شروع ہی سے انھیں پسند کرتا تھا! — باباجان — کیا وہ اسکالرشپ پر گئے تھے!"

"ہاں میاں —" زیدی صاحب بمشکل تمام مسکرائے۔

اس کے پاس باتوں کا خزانہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ یہیں بیٹھا رہے سب بیٹھے رہیں۔ مگر سب کو کام تھا۔ پھر ایک ایک کر کے سب ہی اٹھنے لگے۔ وہ ابھی تک گم سم بیٹھی تھی۔ یکایک فرحان نے اسے اتنی گہری نگاہوں سے دیکھا کہ وہ گھبرا گئی۔

"نہ دعا نہ سلام —" وہ بھاری آواز میں چپکے سے بولا "اتنی اجنبی اور نامہربان آپ سے ہوگئیں!" — وہ بڑے دلکش انداز میں ریلنگ پر ہاتھ ٹکا کر اس کی طرف جھکا! — پھر اس کے جواب دینے سے پہلے اس کا ہاتھ تھاما اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا "زہے نصیب! — آپ نے مجھے یاد رکھا

اور وہ انگلی جس میں اُس کی پہنائی ہوئی انگشتری جگمگا رہی تھی۔ چپکے سے لبوں پہ رکھ لی "اب تو یہ آپ کے ٹھیک ہو گئی ہو گی!"

"فرمان؟" عائشہ گھبرا گئی۔

اس نے اس کا ہاتھ زمی اور آہستگی سے چھوڑ دیا "آیئے ممی کے پاس چلیں۔ میں آپ کے لئے نجانے کیا کچھ اس عرصہ میں اکٹھا کرتا رہا ہوں۔ سب لے آیا ہوں چلئے دیکھ لیجئے۔"

"یہی سب کچھ کرتے رہے کہ پڑھا لکھا بھی؟" عائشہ بولی۔

"گیا اسی لئے تھا" وہ ہنسا "مگر۔ آپ کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ کون سا ایسا لمحہ تھا جب آپ یاد نہیں آئیں۔ کبھی میں آپ کے ساتھ سبزہ زاروں پہ ٹہلتا کبھی پہاڑوں پہ چڑھتا۔ کبھی نشیب کبھی فراز۔ لیکن ہمیشہ میرے ساتھ رہیں!"

"اچھا!" وہ ہنسنے لگی "باتیں بنانا بھی سیکھ گئے ہو"

"اندازِ اظہار نہیں سیکھا!" اُس نے سر جھکا کر کچھ اس طرح کہا کہ عائشہ کا دل دھڑکنے لگا۔

"آپ کو ممی بلا رہی ہیں!" وہاں ماریہ آ گئی۔ فرمان نے برا سا منہ بنایا۔ "تم جاؤ۔ میں آ رہا ہوں!" اس نے اتنی بے رُخی سے کہا کہ ماریہ کا چہرہ اداس ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد عائشہ نے تنبیہ کی "بڑے بد اخلاق ہو گئے ہو۔ فرمان۔ بیچاری بہت اچھی بچی ہے۔ تم نے اس کا دل دکھا دیا!"

پھر وہ اٹھ گئی "تم جاؤ۔ ممی تمہاری منتظر ہوں گی۔ میں بھی تمہارے پیچھے ہی آتی ہوں!"

اس کے جانے کے بعد وہ دیر تک سوچتی رہی کہ کیسے بیگم امتیاز اس کے ڈیڈی کے انتقال کی خبر اسے سنائیں گی۔ وہ تو ایسا خوش ہے۔ کیا حال ہو جائے گا

اس کا؟ —

شام کو چشمی کا خط بیگم زیدی کے نام آیا۔ انھوں نے چند دن ٹھہر کر آنے کا وعدہ کیا تھا! — مگر اُن کے والدین تو ہنوز خفا ہی تھے۔ چشمی نے بھی رنداروی میں خط لکھا تھا۔ بیزار سا۔ پھر اسی شام کو فرمان اپنی ممی کو یہیں لے آیا۔

ممی وہاں گھبراتی ہیں۔“ اس نے بیگم زیدی سے کہا۔ ”میرا بھی دل نہیں لگتا۔ ڈیڈی کی واپسی تک ہم سب یہیں رہیں گے! —“

جس طرح بیگم امتیاز نے خوشامد کر کے زیدی صاحب کو فرمان کے استقبال کے لئے ایرڈروم بھیجا تھا۔ اُسی طرح شفقت کو لینے کے لئے بھی بھیجا۔ اب کی زیدی صاحب کے ساتھ فرمان بھی تھا! ــــ بڑا خوش تھا۔ وہ شفقت کی خوشی دیکھنا چاہتا تھا کیا حال ہوگا اُن کا جب اُن پر یہ منکشف ہوگا کہ فرمان اور وہ بس حقیقی ہی بھائی ہیں! ــــ سارا راستہ وہ باتیں کرتا رہا۔ پھر جب گاڑی ہوائی اڈے پر پہنچ کر رکی ہے تب وہ بے صبری سے لان پر کود گیا۔ــــ ہوائی جہاز کے آنے میں کچھ دیر تھی۔ وہ زیدی صاحب کو لاؤنج میں لے آیا اور بیرے کو کافی کا آرڈر دے کر آہستگی سے کہا۔

"باباجان ۔ ایک بات پوچھوں آپ سے ؟"

کیوں نہیں ۔ بیٹے ؟! ــــ" زیدی صاحب کے ہاتھ میں سگار اور لائٹر کانپنے لگے :

"باباجان ۔ ممی ایسی بے حال کیوں ہیں ۔ انھیں میری آمد کی بھی زیادہ خوشی نہیں ہوئی ۔ کیا کوئی خاص بات ہے ؟ .... کیا ڈیڈی سچ مچ مدراس گئے ہیں؟! ــــ"

ٹھیک اُسی وقت سائرن بجنے لگا ۔ اور دور سے ہوائی جہاز کی آواز سنائی دی زیدی صاحب جواب دئے بغیر اٹھے اور بڑی عجلت سے نیچے آگئے جیسے انھیں لمحہ بھر کی بھی دیر ہو جاتی تو جہاز واپس چلا جاتا!

انڈین ائرلائنز کا دیو ہیکل مسافر بردار طیارہ بالآخر رن وے پر ٹھہر گیا ۔ مسافروں میں ہلچل مچ گئی ۔ زیدی صاحب نے ریلنگ جا پکڑی ۔ فرمان کی مشتاق نظریں رن وے پر دوڑ رہی تھیں ۔ آخر کار آپے شفقت جہاز کے زینے سے اترتے ہوئے نظر آئے گھبرے

نیلے سیاہی مائل سوٹ میں ملبوس۔ برساتی بانہہ پر پڑی تھی۔ وہ مضمحل قدم اٹھاتے ہوئے گیٹ تک پہنچے ۔۔! انھیں شان و گمان بھی نہیں تھا کہ یہاں اُن کو ریسیو کرنے زیدی صاحب اور فرمان بھی آسکتے ہیں۔ وہ تو اس خیال میں تھے کہ شاید انھیں فوری طلبی پر اسی وقت یونیورسٹی جانا پڑے ۔۔!

مگر گیٹ پر زیدی صاحب فرمان کو دیکھ کر اُن کے تعجب اور حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ برساتی ہاتھ سے گر گئی ! ۔۔ اور وہ یکبارگی پتھر کے بُت کی طرح جہاں تہاں تھم گئے۔

"شفقت ؟! " بالآخر گلا صاف کرکے زیدی صاحب نے کہا۔ معلوم نہیں ۔ اُن کی بوڑھی ۔ پُر حسرت آواز میں کیا اثر تھا کہ شفقت اپنی جگہ سے لپکے اور زیدی صاحب کے قدموں سے لپٹ گئے ! ۔۔

"بابا جان ۔۔ میں نے آپ کو بہت دُکھ دیئے !! "

انھوں نے ان کا بازو تھام کر اٹھایا اور گلے سے لگالیا ۔۔

" جو کچھ ہوا۔ وہ میری عجلت پسندی کا نتیجہ تھا !! ۔۔ خیر اب سب ٹھیک ہو جائے گا " زیدی صاحب نے ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا ۔ " سامان باہر رکھواؤ۔ چلو چلیں ۔ ! "

شفقت پہلے کی طرح سادگی سے مسکرا کر فرمان سے ملے " چشم بد دور۔ میں نے پہلی نظر میں تمھیں پہچانا نہیں ...... "

" دوسری نظر ڈالئے گا تو اور حیرت کیجئے گا " فرمان نے کہا۔ وہ انھیں بار بار سر سے پاؤں تک گھور رہا تھا۔ خدا کی شان عجیب ہے۔ کوئی کہتا کہ یہ تمھارے بھائی ہیں تو یقین نہ آتا ۔ مگر اب ۔ ماہ و سال کی گردشوں نے انھیں کیا سے کیا کر دیا ہے ۔۔ !

" فرمان میاں بھی دو تین دن پہلے ہی امریکہ سے آئے ہیں ! ۔ جس طرح میں نے تمھیں بلوالیا اسی طرح انھیں بھی بلوایا ۔ تمھاری ماں تمھیں دیکھنے کے لئے بے چین ہیں ! ۔ "

زیدی صاحب اُن دونوں کو دونوں پہلوؤں پر لئے باہر آئے ۔

آپ نے مجھے بلوا لیا ۔ ؟ "شفقت چلتے چلتے ٹھہر گئے ۔" باباجان مگر ۔ !"
تمہارا پتہ ہوائی کمپنی سے لیا تھا ! ۔۔۔ خیر سب گھر چل کر معلوم ہوگا ۔" زیدی صاحب نے کہا ۔" تم کہے سنے بغیر گھر سے نکل گئے ۔ اچھا نہیں کیا ! ۔"
سب خیریت تو ہے باباجان ؟ ۔۔۔ " شفقت نے پوچھا ۔
" خدا کا شکر ہے ! ۔" زیدی صاحب نے کہا ۔

فرحان کے لبوں تک آ کر رہ گیا ۔ وہ کہہ دے آپ میرے بھائی ہیں ۔ مگر اسے شرم آنے لگی ۔ اس کے باپ کی جذباتیت ظاہر ہوتی ۔ وہ راستے بھر خاموش رہا سب ہی چپ رہے ۔

اُن کے خیر مقدم کے لئے کبھی تقریباً سب ہی دالان میں اکٹھا تھے ۔ عرصہ سے جدا ہونے والے یکبارگی مل جائیں تو کیسی خوشی ہوتی ہے ! ۔ شفقت اپنی نئی پوزیشن سے بے خبر تھے اُن کے لئے یہ استقبال غیر متوقع تھا ۔ انھوں نے سب کو اکٹھا دیکھا تو لڑکھڑا گئے ۔ کسی کو سلام کیا کسی کو کرنا بھول گئے ۔ یکایک بیگم امتیاز نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اس طرح اپنی طرف کھینچا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور سنبھل کر ان کے سینے سے لگ گئے ! وہ اس قدر متحیر و مبہوت تھے ۔ بیگم امتیاز کی یہ محبت اور گریہ وزاری ان کو پریشان کرنے لگی ۔

" کاش ۔ وہ تمھیں دیکھتے ۔ تم میرے پاس ہو ۔ اُن کی نشانی مگر وہ کہاں میرے بچے ۔ وہ تو زندگی بھر ۔ کُلپتے سسکتے رہے ۔ اور تمہیں سینے سے لگائے بغیر چل بسے ۔"
ممی ۔۔۔ !! " اچانک فرحان چیخ پڑا ۔

اب نہیں ضبط ہوتا ۔ مجھ سے ۔ اب نہیں صبر کیا جاتا ! ۔" بیگم امتیاز تھک تھک کر اپنی کمزور بانہوں میں سمیٹے زار و قطار رو رہی تھیں ۔ کانپ رہی تھیں ۔ اور بالکل لرز رہی تھیں ۔ شفقت نے انھیں لرزہ براندام دیکھا تو انھیں اپنے بازوؤں میں

سنبھال لیا۔ سب دم بخود تھے ـــــ فرمان بدحواس ہو رہا تھا!! ـ یہ صورت حال اس کے لئے خلاف توقع اور پریشان کُن تھی۔

بیگم امتیاز پر دفعتہً بیہوشی طاری ہو گئی۔ انھوں نے روتے روتے آہستہ سے شفقت کے کندھے پر سر ٹیک دیا۔

ممی ـ ممی ..... یہ کیا ہو رہا ہے۔ بابا جان ؟ ـ" فرمان پاگل ہونے لگا۔ شفقت نے اُنھیں آہستہ سے لٹا دیا۔ وہ خود بدحواس تھے۔ آخر اُن کی آمد ان کے لئے اتنی موثر کیوں کر ہو سکتی ہے۔ سب کے سب بیگم امتیاز کے گرد جمع ہو گئے۔ عائشہ نے پنکھا کھول دیا۔ فرمان ڈاکٹر کو فون کرنے دوڑا ـ! شفقت نے مبہوت ہو کر بیگم زیدی کو دیکھا۔ وہ کچھ کہنے چلی تھیں۔ اتنے میں بیگم امتیاز نے آنکھیں کھول دیں۔

ممی ـ ؟ ـ" عائشہ ان پر جھکی۔

بیٹی ـ مجھے کچھ نہیں ہوا ـ چکر آ گیا تھا ـ" انھوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میرے بچے کہاں ہیں! ـ"

فرمان ـ فرمان ـ!" شفقت نے بے ساختہ پکارا۔

اکیلا فرمان نہیں ـ تم بھی میرے پاس آؤ ـ اشفاق بھائی ـ آپ نے اس سے کیوں نہیں کہا یہ بھی مرنے والے کا جگر گوشہ ہے! ـ میرے اللہ ..... "بیگم امتیاز نے کمزور آواز میں کہا "مرنے والے کا ـ؟؟ ـ کون مر گیا ـ؟؟" فرمان کے قدم دہلیز پر گڑ گئے۔ اور زیدی صاحب نے ٹھہر ٹھہر کر شفقت سے سب کچھ کہہ دیا۔

شفقت کے لئے یہ ساری داستان طلسم تھی ؟ ـ زیدی صاحب جھوٹ نہیں بول سکتے ـ بیگم امتیاز اتنی بیقرار نہیں ہو سکتیں۔ اور پھر آخر کس مقام کی طرح ایسی داستان اُسے گھڑی جاتی ؟ ـ وہ گم صم بیٹھے رہے! ـــ

فرمان ماں کے پہلو میں سر جھکائے دم بخود بیٹھا رہا! تو امّی ... تو پھر کیا گزرے

نہ دو سال ہو چکے ۔ میں اُن کا منتظر تھا! کیا میں بے سہارا رہ گیا۔ ممی ۔" اس کے لئے یہ خبر بڑی تھی ۔ دلخراش تھی ۔ آپ سے کسی نے منایا سمجھایا نہیں ۔ پھر دیر تک آنسو بہانے کے بعد وہ کسی قدر سنبھلا ، بیگم امتیاز نے کمزور لب و لہجہ میں کہا ۔

" فرمان ۔ کسی کے حالات یکساں نہیں رہتے ؟ ۔ اب تم سمجھ دار ہو ۔ اللہ نے تمھیں ہرگز بے سہارا نہیں چھوڑا ۔ تمھارا بھائی تمھارے سر پر موجود ہے ۔ بیٹا ، اس لئے تم سے نہیں کہا کہ تم پردیس میں تھے ۔ کیا گزرتی تم پر ۔ اب تمھیں صبر کرنا چاہئے ۔ میں نے تم دونوں کی صورتیں دیکھ کر دل کو سمجھا لیا ۔ غم ابدی ہے مگر اس سے فائدہ بھی کیا؟!"

" ان کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے ۔ کوشش کیجئے کہ زیادہ سے زیادہ آرام کریں ۔ کوئی شاک نہ لگے ۔۔۔ ورنہ ۔۔۔ !" اس کے جانے کے بعد شفقت نے زیدی صاحب سے اس کی ہدایت کہہ دی ۔ انھیں کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا! ۔ کیا یہ سچ تھا؟ جو انھوں نے سنا ؟ ۔ ایک بڑے باپ کا بیٹا ، زیدی صاحب کی حقیقی بہن کا لڑکا یا اللہ ۔۔ یہ تو قصے کہانی کی سی بات معلوم ہوتی ہے ۔

وہ امتیاز صاحب کی قد آدم تصویر کے قدموں میں آکھڑے ہوئے چند لمحے انھیں دیکھتے رہے اور پھر آدمکبر تصویر کے قدموں پر سر رکھ دیا ۔

بیگم امتیاز نے بڑی لجاجت سے زیدی صاحب سے کہا ۔" مجھے احساس ہے کہ آپ نے کس طرح شفقت کو پالا پوسا پڑھایا پروان چڑھایا ۔ آپ ہی کا حق اس پر زیادہ ہے مگر وہ اتنے عرصہ تک آپ کے پاس رہ چکا ہے ۔ اب میرے پاس رہنے دیجئے ۔ فرمان کے دل پر اپنے باپ کی موت کا داغ تازہ ہے ۔ وہ بھی بہلا رہے گا !!۔"

ہم سب ایک ہی گھر میں کیوں نہ ساتھ ساتھ رہیں ۔ ممی !" فرمان نے تجویز پیش کی ۔ ہاں ہم سب زیدی بھائی کے یہاں اٹھ جائیں گے ۔ ابھی تو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے !" وہ بولیں ۔ اور اس طرح شفقت زیدی کو کتنے سہارے مل گئے ۔

اور جب تنہائی ہوئی تو بیگم امتیاز نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"شفقت.... بیٹا اپنے مجبور و کمزور باپ کو معاف کر دو۔ مجھے معلوم ہے زیدی صاحب کی خاموشی اور تمھارے باپ کی بزدلی نے تمھیں بہت سے قلبی اور ذہنی دکھ اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ بیٹا۔ شرافت بھی بعض وقت کا شغل بن جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کیسی ستم رسیدہ زندگی گزار چکے ہو۔ مگر اللہ نے اس کا نعم البدل دیا ہے۔ میں تمھاری ماں ہوں۔ فرمان تمھارا اپنا بھائی۔ اب ہم یوں رہیں جیسے تم ہمیشہ ہمارے درمیان اسی گھر میں رہتے آئے ہو۔ میں اب گود بھروں۔ زینت کا تمھارے سوا کوئی نہیں !!۔"

اور پھر شفقت نے اپنی ماں کے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔ وہ اُن کے لب خندۂ شکر کی شیرینی سے چپکنے لگے "مجھے کچھ بھی نہیں چاہئے۔ آپ کی محبت کے سوا۔"

انھیں آئے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے۔ اور اب تو سب کچھ معمول پر آ چلا رہا تھا! مگر شفقت نے صالحہ کو اس عرصہ میں ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا۔ نہ اپنے یہاں نہ زیدی صاحب کے یہاں۔ کسی سے پوچھتے ہوئے حجاب آتا تھا!۔ اُن کی نظریں اس کی متلاشی رہتیں۔ اب تو عائشہ بھی بچی نہیں رہی تھی۔ معلوم نہیں اُن کی کیا کشش اسے کیا کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی۔ فرمان بھی بہت سنجیدہ بن گیا تھا۔

کیا اس کی شادی ہو گئی؟۔ ایک کانٹا ساوں میں چبھ جاتا!۔ وہ کسی اور شہر میں رہتی ہے۔ یا وہ اعلیٰ تعلیم کی خاطر دور چلی گئی؟۔ کچھ پتہ نہیں!!

پھر زیدی صاحب و خیتے پر سبکدوش ہو گئے اور بیگم امتیاز زیادہ بیمار ہو گئیں تب انھوں نے زیدی صاحب اور اُن کی بیوی سے کہا کہ جلد تر شفقت و فرمان کی شادیاں کر دی جائیں!۔ شفقت کا کام افسانہ نویسی ہے۔ فرمان کا دل اپنا ہے وہ باپ کی عزت کا نام بھلا نہیں سکا۔ روز بروز قریب قریب اُن کی قبر ہوتا ہو

یہ کام بھی تم مجھ ہی سے لوگی؟۔ زہرہ!!" زیدی صاحب نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "شمسہ ساری زندگی مجھے لعن طعن کرتی رہیں۔ اور اب تو انھوں نے مجھ سے کہنا ہی چھوڑ دیا۔ تم انہی سے مشورہ کرو۔ میں اس سلسلے میں بالکل بیکار ہوں!"

"اشفاق بھائی۔" بیگم امتیاز نے کہا "مشورہ کیا کرنا ہے۔ آپ ہمیشہ کے لئے زہرہ کو مجھے دے دیجئے۔ اللہ نے یہ صورت نکال دی ہے۔ اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

اعتراض کیسا۔ زہرہ۔" وہ گریہ آلود ہنسی ہنسے "تم یقین کرو کہ میرا ہمیشہ سے یہی خیال رہا ہے۔ اسی لئے میں نے اچھے اچھے پیغام ٹھکرا دیے۔ صابحہ کی تعلیم کا بہانہ بناتا رہا۔ مجھے خدا سے اُمید تھی کہ شاید کوئی نقطۂ آغاز مجھے ایسا مل جائے کہ میں شفقت کی اصلیت پر سے پردہ ہٹا سکوں۔ خدا نے اس کا سامان پیدا کر دیا۔ میری زبان صرف اسی لئے رکتی تھی کہ میں شفقت کے نامعلوم باپ کو کہاں سے لاؤں گا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ میرا گہرا دوست میرا امتیاز ہی اس کا باپ ہے۔ ورنہ میں بہت پہلے ہی یہ کارِ خیر انجام دے دیتا۔"

بیگم زیدی کی نظروں میں وہ دیوتا بن گئے۔ اب وہ بھی خوش اور مطمئن تھیں۔

"آپ کی کیا رائے ہے۔" بیگم امتیاز نے اُن سے پوچھا "قربان کا بیاہ تاریہ سے کر دیا جائے۔ گھر کی بچی ہے۔ اتنی سلیقہ مند۔ خوش اور تمیزدار لڑکی مجھے اور کہاں ملے گی؟"

"نہایت مناسب ہے!" زیدی صاحب خوش ہو کر بولے۔

شفقت کی دلی تمنا جب الفاظ کا پیکر لئے ہوئے اُن کے سامنے آئی تو فرطِ مسرت وجذبات سے اُن کا سر خدا کے حضور میں جھک گیا۔

"یا اللہ شکر ہے۔ میں نے معلوم نہیں کیا کچھ سوچ لیا تھا۔"

مگر فرمان نے بیگم امتیاز کی بات سُن کر سر جھکا لیا ۔۔ انکار، بہ ہمی اور ناگواری اس کے قیافہ سے برس رہی تھی !۔۔

"میں ۔۔ سوچ کر جواب دوں گا۔ ممی !" ۔۔ اُس نے کہا اور بات کو طول دیئے بغیر اُن کے پاس سے اٹھ گیا ۔

صالحہ کے کانوں میں ابھی تک کسی بات کی کوئی بھنک نہیں پڑی تھی ۔ وہ تو شفقت کے طرزِ عمل سے خفا تھی ! اور حد درجہ گوشہ نشین ہو کر رہ گئی تھی ۔ اب بھی تاریک تاریک راتوں کی گمبھیر تنہائی میں وہ موم بتی کی نرم نرم روشنی کے ہالے میں سر جھکائے کچھ نہ کچھ لکھا کرتی !۔ لیکن اب الفاظ اس کے قابو میں نہیں رہ گئے تھے تحریر بے ربط ہوتی ۔ خیالات میں انتشار، تسلسل ٹھوکریں کھاتا رہتا ۔ اور وہ بے خیالی میں کوئی نام لکھ لکھ کر مٹایا کرتی !! ۔۔۔

ایک صبح وہ بڑی تھکی ہاری سی لگ رہی تھی !۔ عائشہ نے پوچھ ہی لیا ۔

"کوئی کہانی اُلجھ گئی ہے باجی ۔ کیا آپ کے بس کی نہیں رہی ؟" اس کی آواز میں شرارت تھی !۔ وہ سب کچھ جانتی تھی مگر صالحہ کی ڈانٹ کے خوف سے اُس سے بول نہ سکی تھی !۔۔

"تم نہیں جانتیں ۔ عائشہ ۔ کوئی کہانی جب الجھ جاتی ہے تو انسان کے دل و دماغ کا کیا حال کرتی ہے" ! عائشہ نے پھر کچھ نہیں کہا ۔

اور صالحہ باغ کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گئی ۔ ملازمہ اس کے لئے یہیں چائے بھی بچھا گئی ۔ صبح نکھری نکھری سی تھی ۔ سورج کی کرنیں درختوں سے چھن کر سنگِ مرمر کی روشوں پر آنکھ مچولی کھیل رہی تھی ۔ لطیف اور معطر ہواؤں کے جھونکے آتے اور اجنبی اجنبی پھولوں کی مہک چھوڑ جاتے !۔ مہک ۔ جو ۔۔ پرانی یادوں کی کہانیاں سناتی ہے !۔۔۔ اس نے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی اور دور افق میں

دیکھنے لگی جہاں بے فکر پرندے ہوا میں تیر رہے تھے۔

دفعتہً اُسے باغ کی چمکیلی روش پر کوئی آتا ہوا نظر آیا۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ زمان ہوگا۔ لیکن جب شفقت کا بلند و بالا سراپا شیڈ کے نیچے سے نکل آیا تب اس کے فرار کی راہیں بھی مسدود ہوگئیں!!۔ انہوں نے دور ہی سے اُسے دیکھ لیا تھا!۔ اور اُسی طرف بڑھ گئے۔ صالحہ کی خفگی بدستور باقی تھی۔ اپنے میدے جذبات اُسے برانگیختہ نہیں کرسکتے تھے وہ خود کو ان احساسات سے بالاتر سمجھتی تھی۔ جب کوئی کسی کے سامنے خواہ مخواہ شرمائے لجائے اور اس کے لئے غلط فہمیوں کا جال پھیلادے۔

قریب پہونچ کر شفقت نے خالص لکھنوی انداز سے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اور جھک کر اُسے سلام کیا۔ جھینپ کر مدھم سی آواز میں اس نے ان کے سلام کا جواب دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اندر کسی سے ملنے جا رہے ہیں!۔ مگر جب وہ کھڑے ہی رہے تو مجبور اُسے اُن کی تقدیم کرنی پڑی۔

اس نے سنگی زینہ کی گرد صاف کی اور اپنا ننھا سا رومال زینہ پر بچھا کر چپکے سے کہا۔" آئیے تشریف رکھئے!۔"

ایک طویل سانس لے کر شفقت نے رومال اٹھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔ پھر وہ اُس سے دو زینے نیچے بیٹھ گئے۔ اس طرح کہ وہ ذرا بھی رخ پھیرتے تو صالحہ کا چہرہ آئینہ کی طرح سامنے ہوتا!

وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ اور صالحہ بھی خاموش نہ ہو سکی۔ نگاہ اپنے پیر پڑی ایک ننھی سی کنکری کو نچاتی رہی! پھر خاموشی بے تکی ہونے لگی تو شفقت نے پوچھا۔

"اس عرصہ میں کیا کیا لکھا ہے صالحہ؟..."

اسے دل ہی دل میں ہنسی آ گئی۔ جب کسی کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہو، اور زبان دل کی ترجمانی سے قاصر ہو تو عموماً ہونٹوں سے ایسے ہی بے تکے فقرے نکلتے ہیں!

"میں نے تو سوچا تھا کہ میں آپ کی وہ تمام کہانیاں اپنے نام سے شائع کروں گی جو آپ چھوڑ گئے تھے۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ سب پہچان جاتے۔ کہاں ذرہ۔ کہاں آفتاب؟"

شفقت کے لبوں پر تبسم مچلنے لگا! — وہ شرمندہ سے ہنسے: "مجھے اب پتہ چلا کہ تم مجھ سے اتنی ناراض کیوں ہو جاتی ہو۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ تخیلات کے خاردار راستوں پر بادیہ پیمائی آسان کام نہیں ہے۔ میں آبلہ پا تھا!... کہاں کہاں نہیں بھاگتا پھرا۔ آج یہاں ذکر دوں، سچ کہتا ہوں۔ مجھے آپ اپنی ذات سے نفرت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ——!"

"کسی کی محبت پر بھی آپ کو بھروسہ نہیں ہے۔ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ [illegible] پر کیسا اثر مرتب ہوگا!"

"صرف تمہاری محبت پر مجھے بھروسہ تھا مگر تم بھی تو مجبور تھیں۔"

نالحہ خاموش رہی۔

"بہر حال۔ خواب کی طرح یہ عرصہ بھی گذر گیا۔ خدا کا شکر ہے۔"

"جی ہاں۔ ہولناک خواب کی تعبیر ہمیشہ دل خوش کن ہوتی ہے!" اس نے تائید کی۔ اور یکبارگی اس کی نظریں شفقت کے نقاہت سے [illegible] پر جم گئیں۔ اور تب اسے یہ احساس ہوا کہ وہ جس سے باتیں کر رہی تھی وہ پرانے دوراندیش [illegible] اور مخلص شفقت نہیں تھے۔ وہ دوسرے تھے۔ چہرے پر عجیب سا شاہانہ وقار تھا۔ آنکھوں میں عجیب [illegible] جذبات۔ قیافے سے متانت، نفاست اور [illegible]۔ بیدار اور سنجیدگی [illegible]

سفید پریس کئے ہوئے پاجامے اور چمکیلے فلیکس میں اُن کی شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی! ــــ صالحہ کی پلکیں جھک گئیں۔

"خدا کرے مجھے بھی ایک خوبصورت تعبیر ملے!!" ــ شفقت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ صالحہ سمجھ نہ سکی ان کا مطلب کیا تھا؟ ــــ

"اوہو۔ آپ یہاں ہیں شفو بھیا!" ــ دفعتہ برآمدے سے عائشہ بولی: "امی کب سے آپ کی منتظر ہیں!" ــ پھر وہ آکر صالحہ کے پاس بیٹھ گئی اور شفقت اٹھ کر چلے گئے

"مبارکباد دے رہی تھیں آنکھیں باجی!" ــ عائشہ بول پڑی۔

"کس بات کی مبارکباد؟" صالحہ نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا: "اللہ توبہ۔ مجھے اُن سے اتنی بھی بات نہیں کرنی چاہیے۔ پتہ نہیں کیا سوچتے ہوں گے دل میں ــــ!"

"اب سوچنے سمجھنے کی ذمہ داری آپ دونوں کی نہیں رہی۔ جو کچھ سوچنا تھا وہ بڑے لوگ سوچ چکے۔ جی ہاں ــــ" عائشہ ہنس کر بولی: "مطلب یہ کہ ممی اپنی بھتیجی کی ہم شبیہہ کو عمر بھر کے لئے اپنا ہی کرنا چاہتی ہیں۔ باباجان نے شفو بھیا کا جواب آپ کے لئے منظور کر لیا ــ"

"فضول باتیں مجھ سے نہ کیا کرو ــ!" صالحہ نے دم بخود ہو کر کہا۔

"اچھا یونہی سہی۔ معلوم ہو جائے گا!" ــ عائشہ نے کہا۔ اتنے میں اندر سے زمان بھی آ نکلا۔ صالحہ گم صم سی تھی ــ وہ اٹھ کر چلی گئی۔

"کیا سوچ رہے ہو زمان؟" ــ عائشہ نے اُسے فکرمند اور اداس دیکھ کر پوچھا وہ اس کے قریب آ بیٹھا۔

"کچھ نہیں!" ــ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "آپ نہیں سمجھیں گی! شاید میں اتنی ہی ناپسند ہوں! ــ"

"نہیں۔ بعض باتیں ہوتی تو سیدھی سادی ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتیں" اُس نے کہا اور پل بھر کچھ سوچنے کے بعد بولا "میں۔ ممی کو بھی نہیں سمجھا سکتا کہ میں ماریہ سے شادی نہیں کروں گا!"

"یہ بہت ضروری ہے۔ فرحان۔ تمہیں ممی کی یہ آرزو پوری کرنی ہی پڑے گی۔"

"مجھے ماریہ اچھی نہیں لگتی۔ ڈرپوک۔ خاموش اور جاہل لڑکی ہے!۔ اس کی بے تحاشہ خوبصورتی بھی مجھے متاثر نہیں کر سکتی۔ میں۔ میں تو کچھ اور چاہتا ہوں"

"کیا چاہتے ہو؟"

"کہیں آپ کی شادی طے نہیں ہوئی اس عرصہ میں؟"

"تجھے کیا فکر ہے تمہیں؟"

"آپ میری بات کا جواب دیجئے۔"

"نہیں بھئی۔ کیسے فضول لڑکے ہو!" وہ جھینپ گئی۔

"مجھے ردکا مت کیجئے" اس نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا۔

"سنئے" اس نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں! عائشہ کا دل دھڑکنے لگا جس پر ابھی تک اس کی پہنائی ہوئی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

"میں نے اپنے لئے ایک بڑی خوبصورت بے حد پیاری لڑکی پسند کر لی ہے!"

"مڈل کلاس خیال ہے؟" عائشہ نے کہا

"جی نہیں۔ میں کسی کلاس ذلیل کو لفٹ نہیں دیتا۔ اُسے تو میں بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ بہت اچھی ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں تو میں آپ کو اس کی تصویر بھی دکھا سکتا ہوں"

یہ کہہ کر وہ بے خبری میں عائشہ کو گھورنے لگا۔ وہ گڑبڑا گئی۔

"آپ کتنی اچھی ہیں۔ ماریہ سے کتنی اچھی۔"

"فرحان ۔۔۔" عائشہ نے دم گرا۔

اتنے میں ایک گاڑی باغ کے گیٹ سے داخل ہوئی اور اس میں سے راجندر اترا۔ فرمان چونک کر اُسے دیکھنے لگا!۔

"یہ کون صاحب ہیں؟!—" وہ بڑبڑایا۔

باجی کے ایک FAN" عائشہ نے زیرلب کہا "راجندر صاحب!" باجی کی حسین تحریروں کا خوبصورت پرستار—" فرمان نے کہا۔ اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہیلو مس عائشہ!—" راجندر نے مسکرا کر کہا۔

"یہ—مسٹر فرمان محمد—میرے کزن!!—" عائشہ ابھی تک دم بخود تھی۔

فرمان اور راجندر نے ہاتھ ملایا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ راجندر بہت حسین تھا۔

اچھا۔ میں چلتا ہوں—" فرمان نے اُداس لہجے میں کہا۔

باجی—اندر ہیں۔ راجندر صاحب!—" عائشہ نروس ہو کر بولی۔

راجندر بے حد سادگی سے مسکرایا "مجھے پروفیسر صاحب سے ملا دیجئے میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ آج جمعہ ہے۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں!—"

دونوں بے حد تعجب سے اُسے دیکھنے لگے۔ وہ دلپذیر انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"جی ہاں۔ اس میں تعجب کی کون سی بات ہے!۔ کیا یہ کوئی جُرم ہے۔ انہونی ہے؟ اس نے پوچھا۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے" فرمان کے منہ سے نکلا۔

تو پھر چلئے۔ ہم سب ساتھ ساتھ جمعہ کی نماز کے لئے عیدگاہ چلیں!" راجندر نے کہا۔ عائشہ وہیں کھڑی رہی۔ فرمان اُسے لے کر اندر بڑھ گیا۔

بیگم امتیاز کو راجندر کی تبدیلیٔ مذہب خالی از علت نہیں معلوم ہوتی تھی وہ اس کی تہ کی چیزیں کہیں دور پہنچی ہوئی محسوس کر رہی تھیں مگر انھوں نے اپنے شک کا اظہار نہیں کیا۔ اور تو کسی کا دھیان بھی اس طرف نہیں گیا تقریباً سب ہی کو اس کے اس طرح اسلام لانے سے بے پناہ مسرت ہوئی تھی!۔۔

اسلامی نام اس نے احمد پسند کیا تھا!۔۔ اور خواہش ظاہر کی تھی کہ پھر کبھی اُسے راجندر کے نام سے مخاطب نہ کیا جائے!۔۔

دوسرے تیسرے دن اس نے زبیدی صاحب کی کوٹھی پر بہت بڑے ڈنر کا انتظام کیا اور محتاط اندازے کے باوجود بہت سے لوگ آگئے!۔۔ راجندر کی مسرت کی انتہا نہیں تھی!۔۔ وہ اس قدر انکسار، عاجزی اور خاکساری سے ان سب سے مل رہا تھا کہ وہ کوئی نہ تھا جو اس کے حسنِ صورت و حسنِ سیرت سے متاثر ہوا ہو!۔۔

وہ سرتاپا سفید لباس میں ملبوس تھا!۔۔ اور سینکڑوں چہروں کے درمیان وہ تنہا چہرہ تھا۔ جسے بدرجۂ احسن حسین کہا جا سکتا تھا!۔۔

ڈنر کے بعد تمام لوگوں نے اسے بے انتہا مبارک باد دی اور تحفوں سے لاد دیا!۔۔ اس کی بہن رتنا اور بھنڈاری رائے صاحب بھی موجود تھے۔ ہر طرح سے مسرور اور فراخدل۔ انھوں نے اس کے اسلام لانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا!۔۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ اس پُرمسرت تقریب کے اختتام پر شفقت و ناہید کی نسبت کا اعلان کر دوں!۔۔" زبیدی صاحب نے کہا۔

"آپ نے میرے دل کی بات چرا لی۔ اشتیاق بجا ہے!۔۔" بیگم امتیاز نے خوش ہو کر

کہاں جائیے۔ کہیں دیر نہ ہو جائے! —"

—مگر یہ اعلان میری زبان سے مناسب نہیں معلوم ہوتا! — اگر فرمان کہہ دے تو کیا حرج ہے! —" زیدی صاحب نے کہا۔ فرمان بصد خوشی راضی ہو گیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ وہ بہت اداس اور دل گرفتہ لگ رہا تھا! اُس نے راجندر کی بے پناہ خوشیوں کو ناگواری سے دیکھا تھا مگر وہ کچھ نہ بولا۔

پھر فرمان نے عشائیہ کے ختم پر سید شفقت حسین صاحب اور مس صالحہ زیدی کی نسبت کا اعلان کر دیا۔

راجندر نے خلوص و محبت سے شفقت کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیے۔

"مبارک باد قبول کیجئے۔ آپ خوش نصیب ہیں۔ محترمہ مس زیدی کو میں اپنی حقیقی بہن کی طرح چاہتا ہوں۔ خدا انھیں آپ کے ساتھ ہمیشہ خوش و خرم رکھے!"

شکریہ۔ احمد صاحب!" شفقت نے مسکرا کر کہا اور وہ بے انتہا خوش ہو گیا۔ صالحہ کو اپنی دیرینہ آرزو کے پوری ہو جانے سے مسرت تو ہوئی تھی۔ مگر وہ خاموش تھی! — اُسے فکر تھی کہ کہیں یہ زیدی صاحب کی کسی مجبوری کا سودا تو نہیں ہے۔ دوسرے دن اسما نے یونیورسٹی سے واپسی پر اُن سے کہا۔

"بابا جان۔ میں آپ کے معیار پر پوری اتری۔ آج مجھے سرکاری اسکالرشپ پر امریکہ جانے کی اجازت مل گئی۔ آپ کے خواب پورے ہو گئے بابا جان! — اب کل پرسوں ویزا اور پاسپورٹ بھی مل جائیں گے —"

ناظم کہاں ہیں بیٹی؟ —" زیدی صاحب نے پوچھا۔ صالحہ نے خاموش کہا کئے ہوئے ناظم انھیں تھما دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے زیدی صاحب نے ناظم پھیلا دیئے! اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"یقیناً میرے خواب پورے ہو گئے — صالحہ۔ لیکن اُن کی تعبیر

میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم امریکہ یا لندن کہیں نہیں جا سکتیں! خدا تمہیں اپنے گھر بار کا کر دے — یہی میرا خواب تھا!"

"یا خدا — کدھر سجدہ کروں؟" بیگم زیدی نے کہا۔

"تم ہمیشہ ناسمجھ رہو گی!" زیدی صاحب جھنجھلا کر اٹھ گئے۔ وہ ہنس پڑیں۔

عائشہ مسلسل دیکھ رہی تھی۔ فرمان کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا ہے اُسے مادیہ کے سایہ سے بھی وحشت ہوتی! — گھر بھی بہت کم جاتا تھا۔ عائشہ سے بہم انداز نے الجھی گئی تھی کہ وہ فرمان کی مرضی معلوم کرے! — ایک رات وہ کھانے کے بعد اکیلا باغ میں ٹہل رہا تھا! — عائشہ نے اُسے پکڑ لیا۔

"کیا مرتاض بننے والے ہو — فرمان!"

"سقراط — جس کے نصیب میں زہر کے پیالے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔"

"کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھ سے بھی نہیں کہہ سکتے!"

جواب میں فرمان نے ایک ہلکی سی آہ بھری۔ اور پھر جیب سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکالا۔ ایک سگریٹ منتخب کیا۔ اور ہونٹوں سے لگا لیا۔

"تم سگریٹ بھی پینے لگے ہو؟!" عائشہ حیرت سے تکتی رہ گئی۔

"جی ہاں!" وہ حوض کی منڈیر پر رک گیا۔ اور مدھم ابھرنے والے چاند پر نظریں جما دیں "بے چینی دل کی — بہلاتا پھرتا ہوں!"

عائشہ نے اس کے ہونٹوں سے سگریٹ نکال کر پانی میں پھینک دیا۔ اور بغور اسے دیکھنے لگی۔ ملگجا لباس۔ پریشان بال، شیو بڑھا ہوا اور سرخ آنکھیں۔ بیقرار انداز۔ وہ متحیر ہونے لگی۔ کیا ہو رہا تھا اسے؟ —

"آپ نا مہربان ہیں۔ ممی نا واقف۔ مادیہ سر پر سوار ہے" اس نے ہونٹوں سے کہا۔

آپ نے تو اتنا بھی نہیں پوچھا کہ فرمان ۔ تم کیا سوچتے رہتے ہو ؟ ۔ زندگی
کا ماحصل ۔ حیات کی آرزو ۔ تمہارے خوابوں کا شہزادہ ۔ مرکزِ محبت ۔ کہاں ہے ؟

کہاں ہے ؟ ! ۔ عائشہ نے مدھم لہجے میں پوچھا ۔

اس کا نام معلوم کرکے خفا تو نہ ہوجائیے گا ؟ ۔ فرمان نے کہا ۔ اور اتنی گہری
نظروں سے اُسے دیکھا کہ وہ گھبرا کر نیچے دیکھنے لگی ۔

"سنئے ! ۔ احمد صاحب بہت خوبصورت انسان ہیں" اس نے اچانک کہا ۔

تو پھر ؟ ۔ مجھ سے کیا مطلب ؟ ۔ عائشہ نے بگڑ کر کہا ۔ آج فرمان کی شوخ
مسکراہٹ بڑی پُراسرار لگی ۔ پھر وہ وہیں بیٹھا رہا اور عائشہ خفا ہو کر اندر چلی گئی
برآمدے ہی اچانک احمد مل گیا ۔ شاید وہ سب سے مل کر واپس جارہا تھا ! ۔

سنئے ! ۔ عائشہ کو تیز تیز قدموں سے جاتے دیکھ کر اس نے آواز دی ۔ وہ کچھ
دور جاکر اس کی طرف مڑی ۔

فرمائیے ! ۔ عائشہ نے نچلا ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا ۔ اس کے کانوں میں فرمان
کا فقرہ گونج رہا تھا ۔ احمد صاحب بہت خوبصورت آدمی ہیں ۔

ہلکی ہلکی چاندنی اور سنگلوں بلب کی روشنی میں گھلا ملا وہ اس قدر دلکش اور
حسین لگ رہا تھا جیسے اپالو میں جان پڑ گئی ہو ۔ عائشہ اُسے دیکھتی ہی رہ گئی ۔

"خدا جانے ۔" پھر وہ مدھم آواز میں بڑبڑایا ۔ "میں کیا کہنا چاہتا تھا آپ
سے ۔ آپ کو دیکھا اور سب کچھ بھول گیا ! ۔

ایک نامعلوم آگ سی عائشہ کے دل میں لگ گئی ۔ وہ جلدی سے مڑی اور
اندر بھاگ گئی ! ۔

میرے اللہ ... یہ میں کیا سوچنے لگا ؟ ۔ ایک سسکی لے کر اس نے ریلنگ پکڑ لی
کیا کچھ سمجھ میں نہیں آتا ؟ ۔ احمد صاحب ؟؟ ۔ فرمان اس کے پیچھے کھڑا تھا ۔ احمد

جھینپ کر ہنسنے لگا۔ "اوہو۔ فرمان میاں ..... آپ۔ سچ مچ آپ بہت خوش نصیب ہیں۔ آپ کو ان سب کی رفاقت کا فخر حاصل ہے۔ لیکن میں سب سے بڑی دور ہوں۔ یکہ و تنہا۔ اداس۔ اپنے غم و تبسم کا آپ آشنا۔!"

وہ عجیب سی نظروں سے احمد کو دیکھنے لگا۔

"عائشہ صاحبہ بہت اچھی ہیں۔" احمد نے کہا۔

"جی ہاں۔ ہیں تو۔ انہی کو آپ غم و تبسم کا آشنا بنانا چاہتے ہیں نا۔"

"نہیں نہیں۔ خدا نخواستہ!!" وہ جلدی سے بولا۔

"احمد صاحب!" فرمان نے سرد لہجے میں کہا "میں جانتا ہوں۔ آپ نے اپنا مذہب کیوں بدلا ہے۔ عائشہ بی بی بڑی اچھی ہیں نا۔ اس لئے!"

"فرمان میاں ۔؟؟" احمد بھونچکا کھڑا رہ گیا۔ اور فرمان اس پر ایک تیز دھاردار نظر ڈال کر باغ میں اتر گیا۔

ساری رات عائشہ مختلف احساسات کی لہروں میں ہچکولے کھاتی۔ توبہ۔ یہ فرمان ایک گستاخ ہو گیا۔ احمد کے حسن و شباب سے اسے کیا مطلب؟ آخر وہ کیا سوچ رہا تھا؟ وہ دریچے میں آ بیٹھی۔ اس کی نظریں نیلی کوٹھی کی طرف اٹھ گئیں۔ بائیں طرف فرمان کا کمرہ تھا۔ جالی دار دریچوں سے روشنی باہر پھوٹ رہی تھی تو وہ بھی نہیں سویا۔ عائشہ مسکرائی۔

صبح کو ڈائننگ روم میں سب تھے۔ مگر وہی نہیں تھا۔

"احمق آدمی۔ شاید اپنی غلطی پر پشیمان ہے!" عائشہ نے کافی پی اور پھر منی کو جھڑکی پلا دی۔ شفقت کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ آتے ہی مسکرائے

"تسلیم۔ بھائی صاحب!" اس نے سر پر آنچل اوڑھ کر ٹھیٹ نازک مشرقی انداز سے سلام کیا۔

آپ سب کے ساتھ چائے پینے نہیں آئے! ۔۔"

وہ بڑی دلکش ہنسی ہنسنے لگے! ۔" دل تو چاہتا تھا مگر ہم نے تمہاری باجی کو پردے میں قید کرنا پسند نہیں کیا۔ میری وجہ سے انہیں خواہ مخواہ تکلیف ہوتی پھر وہ اس کا رخسار تھپک کر بولے "اچھا۔ میں شام کو ملوں گا۔ خدا حافظ!"

وہ بے قدموں آگے بڑھ گئی۔ اور پھر چپکے سے فرحان کے کمرے میں جھانکا! ۔۔۔ وہ نائٹ سوٹ میں ملبوس اپنے بستر پر اوندھا پڑا کسی کی ننھی سی تصویر دیکھ رہا تھا! ۔۔۔ عائشہ نے شرارت سے کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔ اس نے تڑپ کر تصویر تکئے کے نیچے چھپا دی اور سیدھا ہو بیٹھا۔

"سچ بتاؤ۔ کس کی تصویر تھی؟ ۔۔" عائشہ اندر آکر بیٹھ گئی "تم یہ فضول حرکتیں بھی کرنے لگے! ۔۔"

وہ اسے دیکھ کر افسردگی سے مسکرایا۔ اور پھر سر جھکا لیا "اسی لڑکی کی تصویر ہے جس کا تذکرہ میں نے آپ سے کیا تھا! ۔"

"سچ مچ ۔۔" عائشہ نے کہا "تو پھر مجھے بھی دکھاؤ۔ آخر کیا ہے تمہارا انتخاب ۔۔"

"میرے سامنے نہیں" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا! "جب میں کمرے سے باہر چلا جاؤں۔ تب دیکھ لیجئے گا۔ مگر یہ سوچ کر دیکھئے گا کہ یہی میری پہلی اور آخری پسند ہے۔ اگر یہ نہیں تو کوئی بھی نہیں! ۔۔ وعدہ کیجئے کہ آپ سے میری بنا دیجئے گا۔"

"میں دیکھوں تو سہی ۔۔" عائشہ اس کی بدحواسی پہ ہنسنے لگی "پتہ نہیں کیسی لڑکی ہو۔"

"بس آپ وعدہ کیجئے۔ وہ جیسی بھی ہو۔ ہر حال مجھے اچھی لگتی ہے ۔۔"

"اچھا جی ---!" عائشہ کی ہنسی تیز ہو گئی۔ پتہ نہیں۔ اس بیوقوف اور ناسمجھ نے کیسے اور کیوں کر چاہا ہو گا۔

وہ اُٹھ کر دور دریچے میں جا کھڑا ہوا

"اب آپ دیکھ سکتی ہیں!!" اس نے کہا اور عائشہ کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔ عائشہ نے اس کی مسہری پر بیٹھ کر تکیہ الٹا۔ اور یکبارگی ساکت ہو کر رہ گئی۔

وہ اس کی اپنی تصویر تھی۔ جس کے نیچے سفید حاشیہ میں لکھا تھا۔

"آپ کو میں نے اپنی زندگی سے بڑھ کر چاہا ہے!" فرحان۔

عائشہ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چھلک اٹھے۔ دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔ تصویر اس کے ہاتھ میں کانپنے لگی۔

میرے اللہ۔ کیا فرحان اتنا پاگل ہے۔ اس کے ذہن میں بگولے چیخنے لگے:۔ ایک نظر اس نے فرحان پر ڈالی۔ جو اس کی طرف پشت کئے دریچے میں کھڑا تھا۔ معلوم نہیں کیوں۔ وہ عائشہ کو ہمیشہ سے کہیں زیادہ اونچا اور قد آور لگا۔

اس نے دھندلی آنکھوں سے اپنی تصویر کو دیکھا اور آہستہ مسہری پر ڈال کر کمرے سے چلی آئی۔ نیلی کوٹھی سے اپنے کمرے کا فاصلہ طے کرتے کرتے صدیاں لگ گئیں۔ بیخبر اور بے خودسی وہ اپنے بستر پر آ بیٹھی۔ اور یکبارگی اپنی جلتی ہوئی کنپٹیاں جکڑ لیں۔ دفعتہً اس کی نظریں اپنی انگلی پر پڑیں جہاں فرحان کی پہنائی ہوئی ہیرے کی جیش قیمت انگوٹھی جگمگا رہی تھی!۔۔۔

فرحان ۔۔۔!" اس نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ اور بند پلکوں کے سامنے فرحان آکھڑا ہوا۔

پھر اُسے اندازہ ہوا۔ وہ ہی اس کے بھی ذہن میں تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں بسا ہوا۔ نظروں میں گھلا ملا۔ احساسات میں مدغم۔ جذبات میں سمایا ہوا۔

وہ پاگل ہونے لگی۔ فرمان نے اپنی محبت کا ہمیشہ اظہار کیا تھا۔ یہ تو وہی نہیں سمجھ سکی۔ ہر ایک کے اپنے چاہنے کے انداز ہیں!۔

کیا کہیں گی ممی۔ بابا جان۔ دوسرے لوگ؟ — نہیں نہیں۔ اور پھر وہ تو — مجھ سے پورے دو ڈھائی سال چھوٹا ہے۔ یہ کیا حماقت ہے فرمان۔ تم سچ مچ مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم میری آرزو۔ میری خوشی میری زندگی ہو۔ مگر تم پھر بھی میرے کوئی نہیں! — رُخ پھیر وہ اپنی سوچوں کا منہ وہ سسکنے لگی۔

وہ عجیب سے جذباتی طوفان میں گم تھی اُسے وقت کا بھی احساس نہ رہا۔

پھر کسی نے پردہ سرکایا۔

”عائشہ باجی۔ کیا آپ گوشہ نشین ہو گئی ہیں؟“ ماریہ پردے سے چہرہ نکالے مسکرا رہی تھی ”دوپہر کے کھانے کے لئے سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں!“

”فرمان بھی ہیں؟“ اُس نے زبردستی مسکرا کر پوچھا۔

جی ہاں۔ وہ بھی ہیں!“ ماریہ یہ کہہ کر چل دی۔ عائشہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ — اتنی بڑی نادانی ہو گئی ہے۔ اب وہ کیسے فرمان کا سامنا کرے گی؟“ وہ سوچتی رہی ٹہلتی رہی۔ اور پھر بے بس ہو کر رونے لگی تب کہیں اس کے دل میں صالحہ کی آواز گونجی۔

۔ تم نہیں جانتیں۔ عائشہ۔ جب اُلٹی کہانی چلتی ہے تو دل و دماغ کا کیا حشر ہوتا ہے!“

دوپہر ڈھل گئی۔ سہ پہر ہو چلی تھی۔ سب نماز پڑھنے چلے گئے تھے۔ گھر میں سناٹا تھا۔ وہ اپنے تکیے پر سر رکھے روتی رہی۔

فرمان۔ کاش تم میرا نصیب ہوتے۔ مجھے معلوم ہے۔ ماریہ تمھیں چاہتی ہے۔ ممی کی یہی مرضی ہے۔ تمہارا یہ پاگل پن سب میں مجھے رسوا کر دے گا۔

"بی بی - چائے تیار ہے!" ملازم لڑکی نے ہانک لگائی۔

"تم جاؤ - نوری ___!" وہ اُکتا کر بولی۔

وہ اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔

"کیا آپ نے سب سے بائیکاٹ کر رکھا ہے؟" دفعتہ فرمان کی آواز آئی۔ اور اس کا یکبارگی بڑے زور سے دل دھڑکا۔ وہ چہرہ چھپائے لیٹی رہی۔

"اٹھئے۔ میرا غصہ کھانے اور چائے پر نہ اتاریئے!" وہ اس کے پاس آیا اور اس کے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا دئے۔

"آپ تو رونے لگیں!" وہ مسکرا رہا تھا۔ اور عائشہ آنسو بھری آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔

"اس میں رونے دھونے کی کیا بات ہے؟" وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی سے بال ہٹانے لگا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اور پلکیں جھکی ہوئی۔ عائشہ کو وہ بالکل نیا نیا اور اجنبی معلوم ہوا۔

"فرمان! ..." اس نے گلوگیر آواز میں پوچھا "کیا تم نے مجھ سے مذاق کیا تھا؟"

"آپ سے میں نے کبھی مذاق نہیں کیا" اس نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "اگر حالات یہ رخ اختیار نہ کرتے تب بھی میں آپ سے آپ ہی کو مانگتا!"

"فرمان - مگر ___ میں ___ تم سے کتنی بڑی ہوں" وہ روتی رہی۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "بس - یہی ہے آپ کی گریہ وزاری کی وجہ" اس نے اپنے ہاتھ میں عائشہ کا ہاتھ دبالیا۔ "مجھے جواب دیجئے - کیا آپ کو میری محبت کا اندازہ نہیں ہے۔ دیکھئے ___ میں آپ کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"مجھے لے کر کہاں جاؤ گے ___ کہاں؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"جہاں سوائے آپ کے اور میرے اور دوسرا کوئی نہ ہوگا!" اس نے کہا۔ اور پھر

جلدی سے بولا۔ "مگر پہلے آپ باہر نکلئے۔ کھانا کھائیے۔ چائے پیجئے۔ یا اگر فرمائیے تو
میں آپ کا کھانا یہیں لے آؤں!"

"بڑا خیال ہے تمھیں میرا۔" وہ ندامت سے مسکرائی۔

"پریکٹس کرنا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں۔ بعد کو آپ کیسی حکومت مجھ پر کریں"
وہ شرارت سے ہنسنے لگا!۔

"نہیں فرمان۔ تم یہ سب کچھ مت سوچنا" عائشہ نے کہا۔ آج اس کے لہجے پر
غصہ آگیا تھا!۔ "میں تم سے بڑی ہوں اور مجھے ماریہ کی حق تلفی پسند نہیں ہے!"
پل بھر کے لئے فرمان کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ وہ کچھ سوچتا رہا۔ اور پھر اُٹھ کر باہر نکل گیا۔
عائشہ جھجکتی ہوئی باہر نکلی۔ آج سب نے بڑے تعجب سے دیکھا۔ زرد اور
اداس۔ کوئی خاص بات اس کے انداز میں تھی کہ زیدی صاحب کچھ سوچنے لگے!۔
پھر شفقت کو اشارہ کرکے لائبریری میں چلے آئے۔

"بیٹھو بیٹے۔ ایک اہم مسئلہ پر تمھاری رائے جاننا چاہتا ہوں!۔"

"فرمائیے باباجان!۔" شفقت نے بڑے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

"میاں یہ تو تمھیں اندازہ ہے کہ میں اپنی لڑکیوں کی شادی سے کیوں گریزاں
رہتا تھا" انھوں نے کہا۔

"جی۔!" شفقت کا سر جھک گیا۔

زیدی صاحب نے سگار سلگاتے ہوئے کہا: "میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ
کہ تمھاری رائے احمد صاحب کے سلسلے میں کیا ہے؟"

"کس سلسلے میں۔ باباجان!"

"ابھی میں نے کسی سے کہنا مناسب نہ سمجھا تھا" انھوں نے سگار کا ایک ہلکا سا کش لے
کر کہا: "جس دن وہ مہمان ہوئے تھے۔ اسی شب کو ان کی بہن اور بھتیجی نے بات خود

مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں انھیں اپنے خاندان میں شامل کرلوں۔"

عائشہ کے لئے ؟" شفقت نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں ___ میں نے کہہ دیا کہ مسئلہ نازک ہے۔ اپنے عزیزوں سے پوچھ کر جواب دوں گا۔ میں تو انھیں زیادہ جانتا نہیں۔ تمھارے خیالات اُن کی نسبت کیسے ہیں ؟ ___"

"حسنِ صورت میں تو وہ بے مثال ہیں بابا جان۔ حسنِ سیرت کا اندازہ میں نے اس نیت سے نہیں لگایا۔ وہ دراصل آپ کو صالحہ ___!" بے ساختہ شفقت کے منہ سے نکل گیا اور وہ رک کر نظریں چرانے لگے۔

زیدی صاحب کے سنجیدہ چہرے پر لمحہ بھر کے لئے مسکراہٹ کی پرچھائیں کانپی پھر وہ غیر اہم لہجے میں بولے۔

"کہو کہو ___ رک کیوں گئے ؟ ___"

"جی ___ وہ ! انھوں نے قدرے شرمسار لہجے میں کہا: میں یہ کہہ رہا تھا کہ احمد صاحب بہت عرصہ سے صالحہ کے فین رہے ہیں۔ اُن کے پرچے آگینے میں ان کی کہانیاں شائع ہوتی ہیں اور وہ اُن سے شاید ملتے بھی رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ احمد صاحب کی مزاجی کیفیت وہ جانتی ہوں ! ___"

بالکل ٹھیک ہے !" زیدی صاحب نے خوش ہو کر کہا: "اچھا۔ یہ تو بتاؤ فرض کرو کہ وہ ایک معقول اور شریف انسان ثابت ہوئے تو پھر ___ ؟"

"تو پھر ___ بابا جان ___ جیسی آپ کی مرضی ہو ! ___"

"بابا جان ___ میں یہ گستاخی نہیں کرسکتا کہ آپ کو سمجھانے بیٹھوں۔ آپ آفتاب ہیں۔ میں ذرہ۔ مگر بابا جان۔ اسلام نے نومسلموں کو کیا بلند مقام عطا کیا ہے نو ___ زان والے یہ کبھی نہیں مانتے ؟ ؟ ! ___"

بھی تمہاری ذات سے بہت ہمت ہے ۔ ہم تو اب اُن کے در رفتہ ہو چکے ۔ تم باتوں باتوں میں عائشہ کی مرضی معلوم کرنا۔ میں صالحہ سے پوچھوں گا ۔ اگر اس میں کوئی قباحت نہ ہوئی اور وہ واقعی ہمارے معیار پر پورے اترے تو پھر دیکھا جائے گا۔"

یہ کہہ کر زیدی صاحب اُٹھ گئے ۔ شفقت بھی چلے آئے ۔

جیسے جیسے بیگم امتیاز کی صحت گرتی جا رہی تھی اُنھیں اتنی ہی فرمان کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ اُسے بے حد لاابالی، لاپرواہ اور کسی حد تک بدمزاج سمجھ رہی تھیں۔ اس کی وجہ اُن کی سمجھ میں نہ آسکی۔ اُن سے تو وہ پہلے کی طرح ادب و قرینہ سے ملتا مگر ماریہ کی شکل سے بھی اُسے نفرت تھی۔

اسی صبح کو وہ اس کے کمرے میں کافی لے کر گئی تھی؛ — لیکن کافی پینا تو درکنار اُس نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں! —

"آیئے کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے!" — ماریہ نے جھجکتے سے کہا۔

"مجھ پر تم یہ احسان نہ کرو تو تمھارا بڑا احسان ہو۔ ماریہ!" — وہ جلے کٹے لہجے میں بولے۔ ماریہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔ فرمان کے دل میں لاوا پک رہا تھا۔ اگر یہ گنوار دل کی تپش نہ ہوتی تو عالم اُس کی تھی۔ وہ تو ماریہ کی خوش خلقی سے خوفزدہ تھی۔

ستم تو یہ ہوا کہ جب وہ کافی کی ٹرے اُٹھا کر باہر سے نکلا تو اسی قسم کا تذکرہ سُنا۔ اس کی ممی ماریہ کی امی سے کہہ رہی تھیں۔

"معلوم نہیں۔ دن بدن کیوں میں گھلتی جا رہی ہوں۔ اب زندگی کی اُمید نہیں رہی۔ کچھ ایسا دھچکہ دل پر لگا ہے کہ میں کہہ نہیں سکتی۔ تم نے میری التجا قبول کر کے بڑی فکر سے مجھے نجات دے دی۔ خدا فرمان کو ماریہ کے ساتھ ہمیشہ خوش رہنے کی توفیق عطا کرے۔ اب میں شمسہ بہن سے مشورہ کر لوں تو پھر تاریخ بھی جلد ہی طے ہو سکے!"

"جیسی آپ کی مرضی۔ آپ کے سوا اور کون ہے میرا یہاں۔ کیا مجھے خوشی نہ ہو

ہوگی کہ میری بچی ہمیشہ آپ کے پاس رہے! ۔" چھوٹی جان نے کہا۔ ان دونوں ہی کو خبر نہیں تھی کہ فرمان ان کی باتیں سن رہا تھا اور پیچ و تاب کھا رہا تھا! پھر دونوں اٹھ گئیں تو وہ الٹے پاؤں اپنے کمرے میں آیا اور ملازم سے کہا کہ وہ ماریہ کو بھیج دے! ۔

ماریہ کو پہلی مرتبہ فرمان کی طلبی کا پیغام ملا تھا! ۔ اُسے حیرت بھی تھی مسرت بھی۔

"آپ نے مجھے بلایا ہے! ۔" دروازے پر ہی اس نے استفسار کیا۔ فرمان الماری سے پیٹھ ٹیکے کھڑا اُسے بغور دیکھ رہا تھا! ۔ ماریہ کی جھکی ہوئی پلکوں، پھولتی ہوئی سانسوں اور اُڑی اُڑی رنگت سے اس نے اندازہ لگایا وہ گھبرا رہی تھی اور خائف بھی تھی! ۔

ماریہ! ۔" اُس نے بے حد مدھم لہجے میں پکارا۔

جی! ۔" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کی طرف دیکھنے کی ہمت اب بھی نہیں کی۔

"میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ خدا کے لئے شرمائے اور تکلف کئے بغیر مجھے جواب دو! ۔"

وہ چپ رہی۔

ماریہ! ۔" وہ اس کے قریب آیا اور جھک کر سرگوشی کی۔ "مجھے معلوم ہے کہ میرے متعلق تم کیا سوچتی رہتی ہو۔ اس کا مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری توقعات پر پورا نہ اُتر سکا۔ دراصل۔ یہ تو تم بھی جانتی ہو ماریہ کہ محبت ہو یا شادی پسند اور مرضی کا سودا ہوتا ہے۔ فرض کرو کہ تمہیں کسی ایسے شخص سے بیاہ دیا جائے جسے تم پسند نہ کرتیں تو کیا حال ہوگا تمہارا! ۔

وہ خاموش ہی رہی! ۔"

"ماریہ۔ میں مجبور ہوں۔" فرمان نے بڑی بے دردی سے کہا۔ "مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے۔ میں ان کی قدر کرتا ہوں مگر میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ تم مجھے سنگدل نہ سمجھنا لیکن میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ عمر بھر کی ریاکاری اور بناوٹ میں جکڑا رشتہ سے یہ کہیں بہتر ہے کہ میں اپنا نظریہ تم پر ظاہر کر دوں!۔ ماریہ!۔ خدا کے واسطے تم واپس چلی جاؤ۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو۔۔ تم یہ احسان کرو۔ مجھ پر۔۔ یہ میری آخری اور قطعی گفتگو ہے۔ اب میں کچھ سننا یا کہنا نہیں چاہتا!"

وہ صوفہ کی پشت تھامے کھڑی ہی رہی اور فرمان یہ دلشکن فیصلہ کر کے کمرے سے نکل گیا۔۔

اپنا مشن نظر عائشہ کے سامنے رکھ کر وہ بے حد ہلکا پھلکا اور بے تکلف ہوگیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ اُسی کے سامنے رہا کرے۔ عائشہ اس کی آواز سنتی اور اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگتی۔ ہاتھ پاؤں سرد ہو جاتے! اُسے فرمان کے قرب سے شرم آنے لگی تھی!۔

عائشہ کو خبر نہیں تھی کہ فرمان نے ماریہ سے سب کچھ کہہ دیا تھا اور اُس معصوم لڑکی کو آنسوؤں کے حوالے کر کے چلا آیا تھا!۔

گھر میں شفقت اور صالحہ کی شادی کی تیاریاں ہوتی رہیں!۔ دن بڑے خوبصورت ہو گئے تھے!۔ صالحہ ایم۔ اے کر کے گوشہ نشین ہوگئی تھی۔ اب بھی وہ موم بتی کی دھیمی اور ٹھنڈی روشنی میں افسانے لکھتی۔ تب اس کے لبوں پر حسرت انگیز مسکراہٹ کا کہیں سایہ نظر نہیں آتا تھا!۔ وہ روشنی کے مینار کے قریب پہنچ گئی تھی۔

ایک صبح وہ اور عائشہ صحن میں بیٹھی شٹنگ کر رہی تھیں۔ انہیں احمر کے آنے کی خبر ملی۔

نہیں بے آؤ! ــــ" صالحہ نے کہا اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر عائشہ کو دیکھا جو بالکل بے خبر تھی! ـــ دوسرے لمحے راجندر آ گیا۔ آج وہ پہلے کی طرح بے فکر اور متبسم نہیں دکھائی دے رہا تھا! ـــ اس کا حسین چہرہ کسی دکھ کی وجہ سے کمھلایا ہوا لگ رہا تھا! ـــ سفید شیروانی۔ سفید پاجامے اور سفید جوتے میں ملبوس سراپا قرطاس ابیض بنا وہ کچھ اور خوبصورت لگ رہا تھا!۔

"تسلیم ـ احمد صاحب ......" صالحہ نے مسکرا کر کہا!"۔

اُس نے بڑی دلفریب ادا سے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اُسے سلام کیا جس میں عقیدت و احترام کی جھلک بھی موجود تھی! ـــ اور پھر سر جھکا کر کرسی پر ٹک گیا۔ صالحہ نے اس کے لئے کافی منگوائی۔ جب دو چار لمحے خاموشی میں کٹ گئے تو صالحہ نے پوچھا۔

"آپ کو میری کہانی سحرِ داغ دل تو ملی ہوگی؟ ــــ"

"جی ہاں ......" اس نے اُسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا "لیکن میں پرچہ بند کر رہا ہوں۔ اب آبگینے شائع نہیں ہوگا! ـــــ"

"کیوں؟ ـــ" کیا خدا نخواستہ ـــ کوئی مالی پریشانی درپیش ہے! ـــ دفعتہ عائشہ نے پوچھا۔ اور اس کی آواز پر سر اٹھا کر اُس نے دیکھا۔ پھر اُسے صالحہ کے وجود کا بھی ہوش نہیں رہا۔ صالحہ متحیر تھی۔ عائشہ متعجب۔ احمد مبہوت ـــ!"

عجیب حسرت ناک مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی کہ اس کے معنے اخذ کرنے سے صالحہ بھی قاصر تھی ـــ عائشہ کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جھلک اٹھیں۔

اتنے میں ملازمہ کافی لے آئی۔ اور سکوت کا طلسم ٹوٹ گیا۔

"آپ نے بتایا نہیں ـــ" صالحہ نے کافی کی پیالی اس کی طرف بڑھائی۔

"میں وطن واپس جا رہا ہوں ـــ" اُس نے پژمردہ لہجے میں کہا "اور پھر امید

نہیں ہے کہ دوبارہ یہاں آسکوں! ۔ آپ کی کہانی لیتا آیا ہوں۔ دوسروں کے کام آئے گی! ۔" یہ کہہ کر اپنے بیگ سے اس کی کہانی نکال کر میز پر رکھ دی۔

"عائشہ امی کے پاس سے الائچیاں لے آؤ!" عائشہ نے کہا۔ وہ چپکے سے اٹھ کر چلی گئی۔ پھر الائچیاں اُس نے لڑکی کے ہاتھ بھجوا دیں اور خود پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر اُن کی گفتگو سننے لگی۔ اُسے شبہ ہوا تھا۔ عائشہ نے کسی وجہ سے اُسے وہاں سے بھگا دیا تھا!! ۔

"احمد صاحب۔ کیا کوئی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر آپ نے یہ فیصلہ کیا ہے!"

"جی ۔۔۔" اُس نے سر جھکا کر الائچی چھیلتے ہوئے کہا۔ "وجہ تو ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ وہ وجہ میری جذباتیت کی بنا پر مجھے معقول لگتی ہے یا پھر جو کچھ میں سوچ رہا ہوں وہ محض میرا وہم ہی ہے!" ۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی ؟" ۔

"نہیں بہن ۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے کسی خاص نیت اور خاص غرض کے تحت مذہب نہیں تبدیل کیا ۔ مگر بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے صرف آپ کے خاندان میں شامل ہونے کی غرض سے مذہب بدلا ہے ۔" اس نے کہا "میں اپنی ذات پر کئے ہوئے سب حملے برداشت کر سکتا ہوں مگر یہ نہیں برداشت کروں گا کہ میرے مذہب پر اس طرح کیچڑ اچھالی جائے۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ اگر میں آپ کے خاندان میں شامل نہ ہو سکا تو پھر احمد سے راجندر بن جاؤں گا۔"

"نہیں نہیں ۔ کہ از کم میں تو اس طرح سوچ بھی نہیں سکتی!" ۔

"آپ نہ سوچیں ۔ مگر سوچنے والوں کی زبان پہ پہرے بھی نہیں بٹھا سکتیں۔

"عائشہ بہن ۔ یہ میری خوش قسمتی ہوتی کہ میں آپ کے خاندان کا ایک فرد

لیکن اب یہ ممکن نہیں ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس تمام مدت میں کیسا طوفان میرے ذہن میں برپا رہا ہے..... پھر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں وطن واپس چلا جاؤں شاید میں ساری زندگی عائشہ کو یاد رکھوں گا۔ اچھا خدا حافظ؟ ...

"سنیئے۔ آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ احمد صاحب ___" صالحہ نے مسکرا کر جواب دیا: "یہ بات تو بہت پہلے سب کو معلوم ہو گئی تھی۔ اور کل یا شاید پرسوں مجھ سے باباجان کے آپ کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ میں نے آپ کی تعریف کر دی تھی! ___ وہ راضی ہیں آپ کو اپنے کنبہ میں شامل کرنے کے لئے۔ پھر اور کیا چاہئے ___!"

احمد کے دلکش چہرے سے ایک نقاب سا اُٹھ گیا۔

"کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں؟ ___"

"جھوٹ بولنے کی بھی تو کوئی ضرورت نہیں! ___"

"مگر ___ وہ خود ___!"

"وہ بہت معصوم ہے۔ پیاری بچی ہے۔ آپ اپنے ساتھی کو پا کر وہ خوش ہو گی!"

عائشہ کے ہاتھوں سے پردہ چھوٹ گیا۔

میرے اللہ ___ یہ کیا ہو رہا ہے۔ احمد اور اس کا ساتھ؟ ___ وہ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"غلمان کا سا حسین۔ بچے کی طرح معصوم۔ مگر ___ فرمان ___؟!"

وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی اور صوفہ پر گر گئی ___

"یہ میں نہیں کر سکتی۔ نہ فرمان نہ احمد۔ یا خدا ___ یہ میں کس کشمکش میں گرفتار ہو کر رہ گئی ہوں! ___" پتہ نہیں وہ کب تک روتی رہی ___

پھر کسی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا سر تھام کر اٹھایا۔

"عاشی! ___" صالحہ نے اسے اپنی آغوش میں گرا لیا۔ "بیوقوف بچی۔ اس

میں رونے دھونے کی کیا بات ہے۔ ارے یہ تو لڑکیوں کا نصیب ہے! مجھے تو احمد صاحب بے حد پسند ہیں۔ بابا جان نے فیصلہ تم پر چھوڑا ہے۔"

وہ روتی رہی۔ کیا اتنی ناسمجھ ہے۔ دل تو فرمان کو پکار رہا تھا! ——

"معلوم نہیں کس نے اُن کی دل شکنی کی تھی۔ وہ وطن واپس جا رہے تھے مگر میں نے انھیں روک لیا۔ تب ناسمجھ رہی تھی! —— ابھی تو جلدی نہیں ہے۔ تم خوب سمجھ بوجھ کر جواب دینا۔ مجھے تو وہ بہت پسند ہیں۔ خوبصورت شکل میں بے مثال۔ دل کے سیدھے سادے ——!"

"باجی —— مگر ——!" اس کے آنسو نہ تھمے۔

"کیا بات ہے —— بے بات کی بات پر۔ تمھارے آنسو کیوں بہہ رہے ہیں؟ بات

تباجی —— پھر امی تمہارا رشتہ جوڑ دیں گی ——!" اس نے کہا۔ وہ لجا کر ہنس دی۔

"معلوم نہیں۔ ماریہ نے اپنی ماں سے کہا تھا۔ انھوں نے کسی سے کچھ کہے بغیر ایک دن اپنا سامان باندھ لیا۔ اور فوراً واپس جانے پر تیار ہو گئیں۔

بیگم زہرہ متحیر تھیں۔ "یہاں کو چھوڑ کر وہ چلی گئیں؟ بہن! ——

ہمیشہ کے لیے رہنے تھوڑی آئی تھیں بھابی۔ اب تو جانے ہی دیجیے ——"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔" بیگم امتیاز نے تعجب سے کہا۔ "ارے اب تو خدا چاہے گا تو تمھاری بچی بھی اس گھر میں آجائے گی۔" میں نے شفقت سے کہا تھا کہ ——"

"یہ خیال خام ہے بھابی۔ میری بچی فرمان کے قابل نہیں ——" وہ برہم تھیں۔ پھر اسباب درست کرنے لگیں۔ بیگم امتیاز فرمان کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ دریچے کے سامنے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ —— انھیں دیکھتے ہی سگریٹ باغ میں پھینک دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"فرمان۔ بیٹے سچ بتا دو —— کیا تم نے اپنی پھوپھی جان سے بدکلامی کی ہے۔" وہ بہت سنجیدہ

معلوم ہو رہی ہیں !—"

"آپ بیٹھئے تو سہی ۔ ممی !—" وہ گڑبڑا گیا ۔ بیگم امتیاز اس کی مسہری پر ٹک گئیں ۔ اور غصیلی نظروں سے اُسے دیکھنے لگیں ۔

"ممی میں نے اُن سے کوئی بدکلامی نہیں کی —"

"پھر وہ واپس کیوں جا رہی ہیں !—"

"آپ اُنھیں یہاں روکنے پر مُصر کیوں ہیں !—"

"فرمان ؟!—" انھوں نے متعجب ہو کر کہا

"ممی ۔ سوچتے سوچتے میں پاگل ہوا جا رہا ہوں" اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لئے "آپ نے میری مرضی اور رائے کے بغیر ایک ایسی لڑکی کو مجھ سے وابستہ کر دیا ہے ۔ جسے میں بالکل پسند نہیں کرتا !— ممی ۔ میں آپ سے کہنے پر مجبور ہوں آپ ہی کہہ سکتا ہوں ۔ مجھے ماریہ بالکل پسند نہیں ۔ اگر پھوپھی جان نے اس لئے یہ گھر پسند کیا ہے کہ یہاں وہ سب کچھ ہے جس کی ماریہ کو ضرورت ہے تو ممی اُسے یہ دولت ساز و سامان اور —— !"

"خاموش رہو —— یہ میں تمھاری زبان سے کیسی ہلکی باتیں سُن رہی ہوں !" بیگم امتیاز کی سانسیں پھولنے لگیں !—

"آپ نے سُن لیا ۔ بھابی ۔ کیا میں ایک چھوٹے منھ کی اتنی بڑی بات کبھی برداشت کر لوں ؟—" پھوپھی جان دروازے پر کھڑی تھیں ۔ اُن کے لبوں پہ نہایت زہریلی مسکراہٹ تھی ۔

"نہ میں نے آج تک ایسا شاندار گھر دیکھا ہے نہ مجھے کبھی قیمتی ساز و سامان کی ضرورت نظر آئی ہے ۔ نہ میں سرمایہ دار ہوں ۔ میں تو لالچی ہوں ۔ فرمان بھیا سے امیر کبیر باپ کی مفلس بہن ۔ جو اپنی لڑکی کو دولت کے ہاتھ بیچ رہی ہے :—"

"تم بھی نا سمجھی کی باتیں کرنے لگیں!" بیگم امتیاز نے اُن سے کہا۔ اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ "فرحان — تمہیں میری مرضی پوری کرنی ہو گی!"

"ناممکن ہے ممی!" فرحان نے سخت لہجے میں کہا اور پھر دریچے کے باہر دیکھنے لگا!

ان کی سمجھ میں نہیں آیا ایک سیدھا سادا بھولا بھالا لڑکا یک بیک ایسا گستاخ کیوں کر ہو گیا۔ وہ ماریہ کی امی کو کمرے سے نکال لے گئیں۔

بچی جان شکست خوردہ انداز میں رونے لگی تھیں:

"بھابی — اب اگر فرحان چاہے گا بھی تو میں ماریہ کو اس سے نہیں بیاہوں گی۔ اس نے ماریہ سے بھی صاف صاف کہہ دیا۔ وہ تو اب فرحان کے سامنے آنا بھی نہیں چاہتی۔ یہ تو آپ کی خوشی تھی بھابی۔ کیا میں نے آپ سے التجا کی تھی! اب حد ہو چکی ہے۔ مجھے جانے ہی دیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ حالات ناگوار صورت اختیار کر لیں۔"

"اتنی جلدی روانگی کا قصد نہ کرو۔ میں شفقت سے کہوں گی!"

سہ پہر کو شفقت بھی آ گئے۔ اور تنہائی میں بیگم امتیاز نے اپنی مشکلات اُن کے سامنے رکھ دیں۔

"بیٹے اب تم ہی اس خودسر کو سمجھا سکتے ہو۔ مجھے تو غصہ آنے لگا ہے!"

"ممی اگر آپ بُرا نہ مانئے تو میں ایک بات کہوں آپ سے!"

وہ انھیں دیکھنے لگیں۔

"ممی وہ صرف اکیس ہی برس کا تو ہے۔ ابھی سے کیوں آپ اُسے شادی بیاہ کی پابندیوں میں جکڑنا چاہتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ صرف دو تین سال اور ٹھہر جائیے اس کی تعلیم مکمل ہو جائے۔ اور وہ کچھ کرنے لگے۔ تب سوچیں گے!"

"مگر ہو سکتا ہے کہ ماریہ کی شادی پھر کہیں اور ہو جائے!"

"آپ منگنی کے ذریعہ انھیں اپنا پابند کر سکتی ہیں۔ ممی ۔!"

بیگم امتیاز نے طوعاً و کرہاً منگنی پر حامی بھر لی۔

دوسرے دن انھوں نے شفقت کی تجویز فرمان کے سامنے رکھی تھی۔ وہ صاف بگڑ گیا۔

"ممی اب مجھے سکون کے ساتھ جینے دیجئے۔"

زیدی صاحب کو شادی بیاہ کے تذکروں پر ہمیشہ ہنسی آتی تھی۔ معلوم نہیں انھوں نے اپنی شادی کیوں کر لی تھی۔ فرمان کی ضد اور ہٹ دھرمی کو انھوں نے نہایت پسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا! ۔۔۔ اور قہقہہ لگا کر بولے۔

"واقعی وہ میرا اپنا بیٹا ہے۔ ان لغویات میں پڑنا نہیں چاہتا!"

"بھائی صاحب۔ فرمان کی گستاخی سے ہمارے خاندانی رشتوں پر اثر پڑ سکتا ہے۔ اب دیکھئے کہ ماریہ کی والدہ خفا ہو کر جا رہی ہیں۔ شاید ہمیشہ کے لئے ہی خفا ہو جائیں" بیگم امتیاز بولیں۔

"انھیں سمجھا دو۔ بچوں کی بات پر بُرا ماننا بجائے خود بچپن ہے!۔"

عائشہ چند ہی دنوں میں بدل کر رہ گئی۔ اس کی طفلانہ شوخی، خوبصورتی اور لاپرواہی سب غائب ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی! کہ ایک بہت بڑا طوفان اس کے سر سے گزرنے والا ہے اور وہ تمام بدنام ہونے والی ہے۔ آج تک وہ کبھی ایسی کشمکش سے دوچار نہیں ہوئی تھی! ۔ اسے فرمان کی ضد سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

اپنی نجات کا واحد ذریعہ اُسے یہی نظر آ رہا تھا کہ وہ احمد کا پیغام قبول کر لے بلکہ اسے فرمان کی اداسی اور ویرانی کا خیال آتا۔ اس کا انکار فرمان کی تمام زندگی

برباد کر کے رکھ دے گا! — ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی غلط اور خطرناک قسم کا ردِ عمل ظاہر کرے! —

وہ سوچتی گئی پاگل ہوتی گئی — پھر اسے خیال آیا۔ اس کے اقرار اور انکار پر ایک طرف احمد صاحب رکے ہوئے تھے تو دوسری طرف ماریہ کی امی کو بیگم امتیاز نے ٹھہرا رکھا تھا! —

اور سارا کنبہ اس کی اندرونی کشمکش خلفشار اور بے چینی سے بے خبر ہے۔ کیا عالم ہوگا۔ تمام لوگوں کا۔ اگر فرمان نے اپنی زبان کھولی — —

اور پھر ایک صبح وہ اپنی بیقراری کا حل ڈھونڈنے پہنچی۔ بہت دنوں بعد فرمان کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ سفید لباس میں لپٹا سفید شال اوڑھے صوفہ پر بیٹھا ماکچہ کا نیا ناول پڑھ رہا تھا! — اس کا چہرہ اداسیوں اور ویرانیوں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا تھا! —

آہٹ سنکر اس نے پلکیں اٹھائیں اور کتاب تکئے پر پھینک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"آپ؟ —" اس نے حیرت سے کہا۔

عائشہ کے ہاتھ پاؤں سرد ہو رہے تھے! — وہ دروازے کے پاس کھڑی رہی۔

"آیئے۔ بیٹھئے —" اس نے پاس آکر چپکے سے اس کے شانے تھام لیے —

یکبیک عائشہ نے اسکے سینے پر سر جھکا دیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی! —

"اس نے عائشہ کو بڑی نرمی اور شائستگی سے صوفہ پر بٹھا دیا اور اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔

"بس کیجئے۔ میری حماقتوں نے آپ کو بہت سے دکھ پہنچائے ہیں۔ اب سب کچھ بھول جایئے —" وہ اس کے قریب کھڑا اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا! — اور سنجیدہ لہجے میں کہہ رہا تھا! — "ہر گز نہیں — میں نے یہ کیوں سوچا تھا کہ میری بات

آپ کو مسرتوں کی ایک انوکھی کیفیت بخش دے گی ۔ میں نے کچھ سوچا سمجھا نہیں تھا۔ دراصل میں اپنی سمجھداری کی اولین ساعتوں سے آپ ہی کو دیکھتا آرہا ہوں۔ آپ کو میں بہت کچھ سمجھتا ہوں ۔ آپ کی محبت میری زندگی ہے ۔ آپ کا قرب میرے لئے جنت ۔ آپ کی دید میری تسکین کا سامان ۔ مگر آپ کو دکھ پہونچا ہے نا ــــ !
میں تو آپ کے لئے خوشیاں تلاش کرتا ہوں ۔ پریشانیاں نہیں ۔ مجھے معاف کر دیجئے ۔ اب میں پھر امریکہ چلا جاؤں گا ۔ میں نے ہمیشہ مجرد رہنے کا عہد کر لیا ہے ۔ آپ کے لئے احمد صاحب کی درخواست آئی تھی ..... آپ کی جیسی مرضی ہو !"
فرمان ! ــ" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی ۔" تم نے آنسوؤں کی بنیاد پر آہوں کا جو محل کھڑا کیا ہے اس کی حیثیت حباب کی سی ہے ۔ میں تو تمہیں بھی برباد ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی ! ــ اور نہ میں اپنے آپ کو تباہ کر سکتی ہوں ! "
" تو پھر آپ ہی کوئی حل نکالئے ــــ !"
" فرمان ــــ پھر میں کیا کروں ؟ " وہ پھر رونے لگی ! ۔
آپ اپنی دشمن کیوں بن گئی ہیں ! ــ" اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے دھڑکتے دل پر رکھ لیا ۔" خدا کا واسطہ آپ کو مجھے اس قدر خود سے متنفر نہ کیجئے !"
" تم وعدہ کرو کہ تم امریکہ نہیں جاؤ گے ! ــ"
آپ وعدہ کیجئے کہ آپ پھر کبھی نہیں روئیں گی ؟ ــ"
فرمان ؟ ــ" وہ اپنی آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی ۔" مجھے بتا دو ۔ پھر میں کیا کروں ؟ ــ"
میری بن جایئے ــ !" اس نے مدھم لہجے میں کہا ۔" ساری الجھنیں خود بخود ختم ہو جائیں گی ! ــ
" لوگ کیا کہیں گے ۔ میں تو تم سے بڑی ہوں !! ــ"

"لوگوں کا تو کام ہی کہنا ہے۔ آپ کہاں تک اور کب تک کہنے سننے کی پرواہ کریں گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپ کو بڑی کا دورے کر چلا جاؤں گا!"

"سچ مچ؟؟!" وہ متذبذب سی بولی۔

"بالکل سچ!!!" وہ بڑے خوبصورت انداز میں مسکرایا۔ اور اپنے ہاتھوں کے ہالے میں عالیہ کا چہرہ تھام لیا۔

"بس اب ہنس دیجئے!"

"تمہارے ہاتھ کتنے گرم ہیں۔ کیا تمہیں بخار ہے!"

"جی نہیں" وہ پیار سے مسکرایا۔ "بخار تو نہیں ہے۔ مگر آپ کی فکر نے مجھے کئی راتوں سے سونے نہیں دیا۔ میرے سر میں بہت شدید درد ہے!"

"اور تم بیٹھے پڑھ رہے تھے!"

"دل نہیں لگ رہا تھا!"

"اچھا تم لیٹ جاؤ۔ میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔ نیند آجائے گی تو چلی جاؤں گی!"

"پھر آپ کے یہ دکھ جائیں گے۔" اس نے محبت پاش لہجے میں کہا۔ "اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ نے مجھے نئی زندگی عطا کی ہے۔ آپ بھی اب کچھ نہ سوچئے۔ میں دو ہی گھڑی کو جو آپ کہیں۔ اب آپ جائیے اور اطمینان سے سو جائیے۔"

"اچھا۔۔۔!"

"پھر سوچنے نہ بیٹھ جائیے گا۔ کیا کیجئے گا جاگ کے!"

"سو جاؤں گی!"

دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے!

بیگم امتیاز کی ہزار خوشامدوں پر بھی ماریہ کی امی مزید قیام پر آمادہ نہیں ہوئیں ۔ اُن کی خودداری پر بہت زبردست چوٹ پڑی تھی ! ۔

ماریہ بھی جا رہی تھی ! — وہ سہ پہر کو عائشہ سے رخصت ہونے آئی ۔

تم جا رہی ہو ۔ ماریہ ؟ ؟ — عائشہ یکبارگی خالی الذہن سی ہوگئی ۔

پھر وہی کنج قفس پھر وہی تنہائی ہے ۔ ماریہ نے ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا : باجی اگر دعائیں قبول ہوتیں تو تقدیر سے شکایت کس بات کی رہ جاتی ! میں نے کبھی جو کچھ مانگا تھا مجھے نہیں ملا ۔ عائشہ باجی ۔ آپ کو کیا معلوم جب دل ٹوٹتا ہے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے ..... آپ سے سب کچھ میں نے کہا تھا جو کچھ میں نے کہا تھا وہی میری زندگی کا مقصد بھی تھا ۔ مگر اب کیا رہا ہے ۔ میں گاؤں واپس جا رہی ہوں ۔ شاید یہاں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گی ۔ میری تقدیر میں اجنبی ساتھ اجنبی گھر ہوگا ۔ مجھے فراموش کرنی پڑے گی اپنی پہلی اور آخری محبت ۔ اچھا ۔ باجی .... اب مجھے اجازت دیجئے ۔ جس نے فرزانہ بھیا کا دل برا کیا ہے ۔ اُسے تو بس خدا ہی دیکھے گا ! —

اور وہ آگے جھکی ۔ چپکے سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور چھلچھلاتی آنکھوں سے دیکھتی اور گلوگیر لہجے میں بولی ۔

آپ بہت اچھی ہیں ۔ عائشہ باجی ۔ آپ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی ۔ اچھے لوگ زندگی بھر بھلائے نہیں جا سکتے ! — اور بڑی بے چارگی اور بے بسی سے آنسو آنچل سے پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی ۔

عائشہ کا دل دھڑک دھڑک کر تھمنے لگا۔ وہ بہت معصوم جذباتی اور حسّاس لڑکی تھی۔ ماریہ کی باتوں نے اُسے جہنم کے دہانے پر کھڑا کر دیا پھر اسے اپنی جذباتی غلطی کا خیال آیا۔ یکبارگی جیسے کسی نے دل مٹھی میں دبا لیا۔

لوگ کیا کہیں گے!۔۔۔

میرے اللہ۔ ایک تیز ٹیس اس کے دل سے آ ٹکرائی۔

"باجی۔۔۔؟" اس کے گلے سے پھنسی ہوئی چیخ نکلی اور وہ چکرا کر صوفہ پر گر پڑی۔

دالان میں کوئی نہیں تھا!۔

صبح سے بیگم زیدی خریداری میں مصروف تھیں!۔ صالحہ ایک ادبی نشست میں شامل تھی۔ وہ بھی گھر میں نہیں تھی۔ کچن میں ملازم مصروف تھے اور زیدی صاحب دور لائبریری میں بیٹھے کتب بینی میں مشغول تھے!!۔

وہ بڑے کمزور دل کی لڑکی تھی۔ ایک بڑا جذباتی فیصلہ اُس سے ہو نہ سکا!

وہ بے انتہا پریشان ہو رہی تھی!۔۔۔ زخمی احساس تھے۔ زخمی سوچ۔۔۔!!

"او ہو۔ یہاں تو سناٹا ہے!۔" پھر اس نے دالان میں احمد کی آواز سنی۔ وہ ملازم سے پوچھ رہا تھا: "یہ سب کہاں گئے۔۔۔؟"

"جی بیگم صاحب تو شادی کا سامان خریدنے گئی ہیں!۔۔۔ ملازم نے جواب دیا "البتہ چھوٹی بی بی اور سرکار موجود ہیں!۔۔۔"

"اچھا۔ اچھا۔۔۔!" اُس نے کہا اور دیر تک دالان ہی میں کھڑا سوچتا رہا کہ اُسے کیا کرنا چاہئیے پھر وہ ایک فیصلہ کر کے عائشہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اور دو منٹ تک کوئی جواب نہ پا کر چپکے سے کہا۔

"عائشہ!۔ میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں!۔ یا تو مجھے اندر آنے کی

اجازت دیجئے یا آپ ہی باہر آیئے! —"

اس کا بھی اُسے جواب نہیں ملا۔

شرمندگی اور جھینپ کے ملے جلے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے اس نے سوچا کہ گھر میں ہونے والے چرچے سے تو عائشہ لاعلم نہیں ہو گی۔ کیا حرج ہے اگر وہ اُس سے اس کی مرضی پوچھ لے۔ دونوں تعلیم یافتہ روشن خیال ہیں۔

اُس نے آہستہ سے پردہ ہٹایا اور ٹھٹھک گیا۔

عائشہ صوفہ پر بے ترتیب پڑی تھی کُشن سے اس کا سر ڈھلکا ہوا تھا سانس دھیمی چل رہی تھی! — چہرہ زرد ہو رہا تھا! —

وہ جھپٹ کر اندر پہونچا اور دروازہ کھول دیا۔

"عائشہ! —" اُس نے چیخ کر کہا اور جھک کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا پیشانی پسینے میں بھیگی ہوئی برف ہو رہی تھی!

عائشہ ۔ عائشہ —— !" وہ پاگل ہونے لگا! —

اور عائشہ نے بڑی دقّت سے پلکوں کو پلکوں سے جدا کیا۔

"آپ ......؟" اس کے لب کانپے۔

"تمھیں کیا ہوا ہے۔ عائشہ۔ خدا کی پناہ۔ کیا تمھاری طبیعت خراب ہے؟"

"میرے سینے میں — بہت درد ہے۔ آپ امی کو — بلا دیجئے — !" وہ رک رک کر بولی۔ احمد نے ملازم کو حکم دیا کہ وہ فوراً زیدی صاحب کو بلا لائے۔

انھوں نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ ننگے پاؤں ہی دوڑے آئے تھے۔

"احمد —" وہ گھبرا کر بولے —— "کیا بات ہے؟! — کیا ہوا —— ؟"

"میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بابا جان۔ میں تو ابھی ابھی آیا۔" دل احمد بدحواس تھا۔

ان کے سارے جسم میں لرزہ طاری تھا!۔ وہ اُسے سنبھال ہی نہ سکے!۔ اور بدحواسی میں بڑی ملتجی نظروں سے احمد کو دیکھنے لگے!۔

"آئیے ہیں آپ کو باہر لے چلوں" احمد نے بے ضبط ہو کر کہا۔ اور زبردستی مسکرایا! "اتنی ذرا سی اختلاجی کیفیت میں آپ اس قدر پریشان ہو گئیں۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں!۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ بول ہی نہ سکی۔

راجندر نے اُسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا اور بڑی آہستگی اور نرمی سے باہر لا کر دیوان پر لٹا دیا۔

"ڈاکٹر صاحب آئے ہیں!۔" قادر نے کہا۔ بیگم امتیاز کو پردہ کا ہوش ہی کہاں تھا!۔ انھوں نے وہیں ڈاکٹر صاحب کو بلا لیا۔

جب تک وہ گہری سنجیدگی اور توجہ سے عائشہ کو دیکھتے رہے۔ تب تک سب دم سادھے آنکھیں گستے رہے!۔ پھر انھوں نے بلڈ پریشر کو گراف دیکھ کر کیس بند کیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

احمد نے اُن سے انگریزی میں پوچھا: "کیا قصہ ہے جناب۔!"

"آل۔ او۔ کے!۔" وہ عائشہ کا گال تھپک کر ہنسے: "کچھ بھی نہیں!۔"

اور احمد کو باہر آنے کا اشارہ کر کے ہال سے نکل آئے۔ وہ ان کا بیگ لے کر ان کے پیچھے چلا گیا!۔ کرنل صفدر راہداری میں تھم گئے۔

"کیس بے حد سیریس ہے۔ جناب!" انھوں نے کہا "کسی سخت اندرونی کشمکش نے ہائپر ہارٹ اٹیک کی صورت اختیار کر لی ہے۔ میں چوبیس گھنٹے تک لڑکی کی کوئی ضمانت نہیں لے سکتا!۔ آپ اُسے نرسنگ ہوم میں داخل کرا دیں تو بہتر ہے! مگر لڑکی سے نہ کہیے گا۔ وہ گھبرا جائے گی۔ ہم اس کا بہترین ٹریٹمنٹ کریں گے۔"

اسے ابھی کھلی چھوڑ کر گئی تھی۔ سچ بتایئے۔ کیا آپ نے اُسے کچھ کہا تھا۔"

"نہیں۔ بیگم!۔" زیدی صاحب نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"کچھ کیجئے۔ اشفاق بھائی۔ خدارا۔ کوئی علاج جلدی کیجئے!۔" بیگم امتیاز نے بے تاب ہو کر کہا۔

صالحہ دیکھ رہی تھی۔ عائشہ دیوان پر چپ چاپ پڑی تھی۔ اس کی سانسیں غیر معمولی طور پر بوجھل رہی تھیں۔ اُن کا زیر و بم بھی بے ترتیب تھا۔

"عاشی!۔" اس نے اس پر جھک کر پکارا۔

"ہاں۔۔ باجی۔۔!" عائشہ نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

"عاشی۔ تم پریشان کر رہی ہو سب کو۔" صالحہ نے اس کے لب چوم لئے۔ "اٹھو۔ عائشہ۔ چلو کہیں گھوم آئیں۔"

"چلئے باجی!۔" اس نے حسرت سے مسکرا کر کہا۔

زیدی صاحب نے قادر سے کہہ کر گاڑی دالان کے اختتام پر ہی منگوا لی۔ اب بھی احمد ہی نے عائشہ کو باہوں پر اٹھایا اور بڑی نرمی سے اُسے پچھلی سیٹ پر لٹا دیا

"کیا میں بہت سخت بیمار ہو گئی ہوں۔ احمد صاحب؟۔" وہ اتنی سب کی احتیاط سے سراسیمہ ہو گئی۔

"نہیں نہیں!۔" احمد کو اپنے آپ پر قابو پانا دشوار ہو گیا۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں اس کا ناتواں چہرہ دبا لیا۔ اور کسی کی موجودگی کا خیال کئے بغیر اس کے چہرے پر اپنا چہرہ جھکا دیا۔

"عائشہ! گھبرانا نہیں۔ اللہ بہت بڑا ہے!۔"

"جلدی کیجئے!۔" صالحہ نے کہا۔ بیگم زیدی اور بیگم امتیاز اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ زیدی صاحب ڈرائیور کے پاس تھے۔ گاڑی گیٹ سے نکلی۔ آہستہ آہستہ

سڑک پر آئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

"میں بھی چلوں گی۔ میرا دل قابو میں نہیں ہے۔" صالحہ اب رونے لگی تھی۔ احمد کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے!۔

"صالحہ بہن!" اُس نے جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا "میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ پاؤں پڑتا ہوں۔ آپ فقط میرا اتنا پیغام اُن تک پہنچا دیجئے کہ اگر میری اس زیادتی کی بنا پر اس حال کو پہنچی ہیں تو خدا کی قسم۔ میں اپنی آئندہ سے دست بردار ہوا۔ وہ صحت مند اور تندرست رہیں۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔"

"اچھا!" صالحہ نے مردہ لہجے میں کہا۔ اتنے میں اقبال صاحب کی کار گیٹ میں داخل ہوئی اور اس میں سے شفقت و فرمان اترے۔ صالحہ کو یوں بے نقاب کھڑے دیکھ کر شفقت کو قدرے تعجب سا ہوا تھا۔ مگر وہ کچھ نہ بولے۔ البتہ انہیں کوئی غیر معمولی احساس کسی غیر معمولی صورت حال کا ضرور تھا۔

فرمان متحیرانہ انداز میں صالحہ اور احمد کو دیکھ رہا تھا!

"خدا کی پناہ!" اچانک وہ چیخ اٹھا "آپ دونوں رو رہے ہیں!؟"

"خیر!" شفقت جہاں تھے وہیں ٹھٹھر گئے "کیا بات ہے؟!"

پرسش پر صالحہ کے آنسو تیزی سے بہہ چلے۔

احمد نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے سارا واقعہ سنایا

"وہ ہسپتال بھی گئیں؟" فرمان نے پوچھا۔ اور لڑکھڑا کر گاڑی کا سہارا لے لیا۔

"چلئے تو پھر چلیں" شفقت نے کہا "خدا صاحب کے حال پر رحم کرے۔ اور وہ تو اکیلی بچی ہے۔ میری گود میں کھلائی ہوئی ہے۔ آہ خدانخواستہ کوئی سانحہ کون ماں باپ ایسا سہہ سکتا ہے جو اس کے دل پر بنا دے۔ صالحہ۔ فرمان اور آپ بھی احمد صاحب چلئے نرسنگ ہوم!"

شفقت کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ اُن سے ضبط محال تھا۔ عائشہ کی معصوم ہنسی بکھر شکل نظروں تلے پھر رہی تھی!۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انھوں نے چہرہ پھیر لیا۔

فرحان سب کچھ سمجھ گیا تھا!۔ یہ اس کی ضد، خود سری اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے اس کا دل خزاں دیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا!۔

ہسپتال تک وہ سب خاموش اپنی اپنی جگہ بیٹھے سوچتے رہے!۔

پھر ایک نرسنگ۔ اَرْدلی انھیں دوسری منزل پر لے گیا۔

"یا اللہ۔ سب اچھا کیجیئے۔ میری عائشہ اچھی ہو کر پھر گھر چلی آئے" صالحہ کے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے!۔

"صالحہ!" شفقت نے نرم لہجے میں تنبیہ کی "کیا تم اسی طرح روتی ہوئی اس کے پاس جاؤ گی۔ اُسے یاد کراؤ گی کہ وہ خطرے میں ہے۔ صالحہ۔ خدا کے لئے آنسو پونچھ لو۔ اور مسکراتی ہوئی اس کے سامنے جاؤ۔۔ یا اللہ۔ یا اللہ رحم کر!"

اچانک وہ خود ہی بے ضبط ہو گئے!۔

"آئیے!" نرس نے وارڈ کا پھولدار پردہ سرکا یا سامنے ... پر عائشہ سیدھی بے حس و حرکت لیٹی دکھائی دی!۔ اس کے ارد گرد سب ... نہیں اُن کے دلوں کا کیا حال تھا لیکن عائشہ کی ... وہ سب مسکرا رہے تھے!۔

شفقت اس کی طرف بڑھے۔ نرس نے چپکے سے کہا۔

"سر نہیں!۔ اُن سے زیادہ باتیں نہ کیجئے۔!۔ اور نہ انھیں کسی بات کا جواب دینے پر مجبور کیجئے۔۔"

"بہت اچھا۔" وہ ایک نظر عائشہ پر ڈال کر ہٹ گئے اور جلدی جلدی ... کر اپنے آنسو پونچھ لئے۔ ... اُسے دیکھ کر ہٹ جاؤں گا ...

کہوں گا نہ کچھ کہنے پر اُسے مجبور کروں گا! —"

نرس نے اُس کے وارڈ تک رہنمائی کی۔ شفقت عائشہ کو دیکھ کر مسکرائے۔

"بھئی یہاں تو تم مہمان ہو۔" وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگے: "کل ہی اچھی ہو کر گھر چلی آنا۔ بے نامی.... عائشہ تم نے اسے اپنا وہ نیا افسانہ سنایا۔ جس میں تم نے ایک بیٹو نواب صاحب کا نقشہ کھینچا ہے۔ فرمان.... میرا خیال ہے کہ تمہیں رائیڈنگ کے لئے اب کی دو نہایت اعلیٰ اور طاقتور نسل کے گھوڑے خرید لینا چاہئیے۔ ! کیوں؟ —"

"ڈیڈی۔ میں اچھی ہو جاؤں گی نا؟ —" عائشہ نے پوچھا۔ وہ اپنے سفید بستر پر پڑی تھی۔ کمزوری تکان اور اضمحلال کی تصویر۔ زرد چہرہ۔ حلقوں میں متحرک آنکھیں۔ پپڑیاں جمے ہوئے لب۔

شفقت نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا: "احمق بچی۔ تجھے ہوا کیا ہے۔ محض اتنی سی گھبراہٹ کو ان لوگوں نے اختلاج کا نام دے دیا۔ لاحول ولاقوۃ۔ تم چاہو تو ابھی چلو! —"

"پھر مجھے لے چلئے نا شفو بھیا! یہاں مجھے ڈر لگ رہا ہے! —"

"ضرور ضرور۔ میں کرنل صفدر سے پوچھ لوں۔ پھر! —" شفقت نے کہا اور پاس سے اٹھ گئے۔ اُن کا دل رو رہا تھا! — مگر وہ دکھاوے کو ہنس رہے تھے۔ کہیں عائشہ گھبرا نہ جائے۔ پھر وہ برآمدے میں نکلے اور آسمان کی طرف دیکھ کر بے اختیار رونے لگے! —

عائشہ سو رہی تھی۔ اس کے وارڈ میں سب موجود تھے۔ خاموش اور منتظر پھر دھیرے دھیرے رات نے اپنے پنکھ پھیلا دئے۔ ہسپتال پر ایک سوگوار سناٹا مسلط تھا۔ اس روح فرسا سناٹے میں کبھی کسی بیمار کی جگر خراش کراہ سنائی دیتی

کبھی اسٹریچر کی بھیانک گھڑ گھڑ کی آواز آتی ۔ اور پھر ہولناک سکوت چھا جاتا۔

فرمان اپنی زیادتی ۔ ضد اور ہٹ دھرمی پر اس قدر شدت سے پچھتا رہا تھا کہ وہ خودکشی کے امکان پر غور کرنے لگا تھا! ۔ سب سے الگ تھلگ کھڑکی میں کھڑا تاریک آسمان کو گھورے جا رہا تھا انجام اس کی سمجھ سے باہر تھا ایک بار اس نے سہ منزلہ سے جھک کر نیچے دیکھا ۔ بہت نیچے ۔ جہاں عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں بہت سے ناتراشیدہ پتھر پڑے ہوئے تھے ۔

اس نے سوچا کہ اگر عائشہ کا بال بیکا ہوا تو وہ اسی سہ منزلہ سے نیچے پتھروں پر چھلانگ لگا دے گا ۔ انجام ظاہر ہے ۔ اتنا بڑا داغ دل پر اٹھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی! ۔

بیگم زیدی کے ہونٹوں پر دعائیں تھیں اور وہ لگاتار عائشہ کی ڈوبتی ابھرتی سانسوں کو دیکھ رہی تھیں ۔ بیگم امتیاز کا حال ان سے بھی بدتر تھا ۔ صالحہ دامن پھیلائے ہوئے تھی ۔

وہ چوبیس گھنٹے جن کی ذمہ داری کرنل صفدر نے نہیں لی تھی ۔ وہ آہستہ آہستہ گزر رہے تھے ۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور شب بھر کے جاگے ہوئے تیمارداروں کو آس بندھی ۔ نجر کے وقت کرنل صفدر آئے ۔ اور بڑی خوشی سے عائشہ کو دیکھا!

خطرہ تو ٹل گیا ۔ کرنل صاحب ؟ " فرمان نے مدھم لہجے میں پوچھا ۔

بس یہ دن گزر جائے ۔ !" انھوں نے جواب دیا اور اپنے اسسٹنٹ سے کچھ کہہ کر چلے گئے ۔

عائشہ سارا دن بستر پر پڑی رہی ۔ اس پر غفلت طاری تھی! ۔ دن بھر وہ سب بھوکے پیاسے اس کے پاس رہے ۔

اور جب وہ دن بھی گزر گیا تب کرنل صاحب نے اپنے ساتھیوں سے ملکر

اس کا علاج جاری کیا۔

"صالحہ بہن...... " احمد نے کہا: "میرا خیال ہے کہ آپ اُن تک پیغام پہنچا دیجئے کہ میرے لئے اُن کی صحت سب کچھ ہے۔ وہ خود بخود اچھی ہو جائیں گی!"

معلوم نہیں۔ کیا ردِعمل ہو گا۔ احمد صاحب!" صالحہ ڈر رہی تھی!

"بہت خوشگوار ہو گا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ناگوار علالت کسی ایک فیصلے پر پہنچنے کا نتیجہ ہے۔" اس نے کہا: "جب آپ اُن سے میری بات کہہ دیں گی تو وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

لیکن صالحہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بیمار بہن کی زندگی اور موت کی خاطر ایسا رسک لے سکتی!

ایک دن عائشہ نسبتاً صحت مند تھی! صالحہ نے اُسے سمجھایا۔

"کیا تم اس لئے پریشان ہو گئیں کہ احمد صاحب کے سلسلے میں کوئی جواب نہیں دے سکی تھیں؟"

"نہیں۔ باجی!" وہ مدھم سا مسکرائی: "مجھے اپنا خیال کب تھا؟"

اور اتنا ہی کہہ کر وہ تھک گئی۔ صالحہ نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔

تین چار دن بعد وہ سب گھر واپس آ گئے۔ عائشہ نرسنگ ہوم میں تھی! اُسے دیکھنے سب جاتے تھے! فرحان کا جی چاہتا تھا کہ وہ شب و روز اس کے پاس رہے لیکن وہ اس کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا! سب کے ساتھ آتا اور ساتھ ہی واپس چلا جاتا۔

ایک دن عائشہ نے اس سے پوچھ لیا۔

"اب تمہارے پاس مجھ سے کہنے سننے کے لئے کچھ بھی نہیں رہا۔ فرحان؟"

اور وہ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے روتا رہا۔

"یہ نوبت میری وجہ سے آئی ہے۔ اگر مجھے آپ کو دیکھے بغیر قرار آجاتا تو میں
آپ کا سامنا بھی نہ کرتا! ۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے بہت زیادتی کی ہے!
اسی لئے مجھے خدا نے ایسی سزا دی۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ اب مجھے آپ کی
ہر خوشی بسر و چشم منظور ہے۔ میں آپ کو ایسی حالت میں نہیں دیکھ سکتا! ۔ مجھے
معاف کر دیجئے! ۔"

"ہاں فرحان! ۔" عائشہ نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں: "اسی طرح مجھے سکون
پہنچانے کی کوشش کرو۔ ایک فیصلہ مجھ سے ہو نہ سکا!"

"آپ کچھ نہ سوچئے ۔" فرحان نے اپنے آنسو پونچھے اور بڑے پُرسکون لہجے
میں اُسے تسلی دی:

"میں آپ سے وعدہ کر رہا ہوں کہ آپ کی جیسی خوشی ہوگی میں وہی کروں گا:"
"میری خاطر یا اپنی مرضی سے؟" عائشہ مسکرائی۔

فرحان کے لئے پھر جواب دینا مشکل ہو گیا۔ اگر وہ عائشہ کی خوشی کو مقدم
رکھے تب بھی وہ سمجھے گی کہ یہ جبر کا سودا ہے اور اگر اپنی مرضی کا اظہار کرے تو
وہ سوچے گی اب تک جو کچھ فرحان نے کہا تھا سب مکاری تھی۔ وہ بے وفائی کر رہا ہے!
وہ چپ چاپ اس کی شکل تکتا رہا۔ رات کا فسوں گہرا ہو چلا تھا۔ ستاروں کا نور
نکھر رہا تھا۔ ہواؤں میں جنبی پھولوں کی ناگوار مہک بسی تھی۔

فرحان کو اپنے بستر پر لیٹی ہوئی عائشہ بالکل غیر اور تنہا سی لگ رہی تھی! ۔
اس کے چہرے پر زندگی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا! عجیب سی ویرانی طاری تھی
جسے دیکھ دیکھ کر دل بیٹھنے لگتا تھا۔

"اب آپ اچھی ہو کر گھر چلئے:" اس نے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔
"میری زندگی یا مرضی کا فیصلہ ایسا اہم نہ تھا کہ آپ نے اپنی جان پر بنا لی۔ ہمارے۔۔۔

ہوئے آپ نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ فرمان کا کیا حشر ہوگا۔ جب وہ سنے گا کہ عائشہ ہار گئی!"

وہ ہنسی۔ "کتنا اچھا لگتا ہے۔ تمھارے لبوں پر میرا نام ۔۔۔" پھر وہ اس کے چہرے کو تکنے لگی۔

"فرمان ۔۔۔ تم نے محسوس نہیں کیا۔ یہاں کتنا سکون ہے۔ کتنی راحت ہے۔ نجانے یہاں موت کا خیال کیوں نہیں آتا؟ ۔ زندگی کا حسن تو جب نکھرتا ہے۔ جب موت کا ڈر دامنگیر ہو۔ تم دریچے سے باہر بکھرا ہوا حسن تو دیکھو۔ نیلا آسمان۔ شفق ستارے۔ یہ پھول۔ وہ چاند۔ پتہ نہیں۔ پہلے کبھی ان سب چیزوں کو میں نے جی بھر کے کیوں نہیں دیکھا تھا۔ شاید یہ اس لئے اچھی لگنے لگیں کہ ۔۔۔ جدا ہونے والی ہوں!۔۔۔"

"ایسی باتیں مت کیجئے۔" فرمان نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"منحوس ۔۔۔" اس نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ "تم نے یہ انگوٹھی مجھے پہنائی تھی نا؟ یہ اب ماریہ کو پہنا دو ۔۔۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔۔۔ اگر روشنی کا مینار زندگیوں سے معمور ایک جہاز کو ساحل سے لگا کر غرقِ آب ہو جائے تو اس کی زندگی سوارت ہو جائے۔ لائیے دے دیجئے۔"

اور انگشتری اتار کر وہ بے حد غمگین ہو گئی۔

فرمان جس فیصلے پر بدرجۂ مجبوری رضامند ہوا تھا۔ اس نے اس کی زندگی تہہ و بالا کر کے رکھ دی۔ پھوپھی جان کو خوشی تھی کہ بالآخر ماریہ کو فرمان نے انگشتری پہنا ہی دی۔

"یہ روح و جسم کا فلسفہ ہے ماریہ!" فرمان نے بڑی نفرت سے کہا تھا۔ "جسے تم کبھی نہ سمجھ سکو گی۔ تم خوش ہو گی کہ آخر کار تم نے مجھے شکست دے دی۔ مگر تم کیا جانو۔ میری روح آزاد ہے وہ اُسی کی رہے گی جس کے لئے لکھی گئی ہے!"

شفقت دیکھ رہے تھے کہ فرمان بہت گم صُم خود فراموش اور سنجیدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ فرمان کا فیصلہ مجبوری کا تھا مگر ان کے پوچھنے پر وہ ہنس پڑا۔

"آپ سب لوگ نجانے کیا کچھ سوچا کرتے ہیں۔ بھائی صاحب۔ میں نے ممی کی آرزو پوری کر دی!" "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے!" شفقت خاموش ہو گئے۔

ماریہ ناسمجھ تو نہیں تھی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی! ایک مرتبہ وہ عائشہ سے ملنے آئی۔ تو پہلے سے بہت اُداس لگ رہی تھی۔ عائشہ نے اس کے چہرے سے اس کی خوشیوں کا اندازہ لگانے کی ناکام کوشش کی اور پھر مدھم لہجے میں پوچھا۔

"تم فرمان کی کسی حماقت کو محسوس کر رہی ہو۔ ماریہ؟!"

وہ سر جھکائے ہوئے انگشتری انگلی میں گھما رہی تھی۔ چپکے سے بولی۔ "عائشہ باجی اب ان الجھنوں میں نہ پڑیئے۔ بس اب اچھی ہو جایئے۔ جس کے ساتھ کسی کا مقدر بندھ کر رہ جاتا ہے وہ اُسی کی رفاقت میں خوش رہتا ہے۔"

کیا فائدہ اگر میں نے جسمانی سکھ حاصل کر لیا۔ اور میری روح پیاسی رہی ۔"

اور اس نے انگوٹھی اتار کر اس کے پاس رکھ دی۔ پھر کمرے سے نکل کر چلی گئی !۔

وہ اب اچھی ہو رہی تھی ۔ خوش رہنے کی کوشش کرتی ۔ بات بات پر ہنستی اور ہمیشہ مسکراتی رہتی ۔ اُس شام فرمان اس سے ملنے گیا تو اسے بیحد مسرت ہوئی !۔ وہ اپنی تقدیر پہ قانع ہو گیا تھا !۔ بہر حال وہ عائشہ کے لئے ایثار کرے گا !۔

سہ پہر کی روشنی ابھی مدھم نہیں ہوئی تھی ۔ برآمدہ گملوں میں کھلے پھولوں سے مہک رہا تھا !۔ عائشہ آرام کرسی پر نیم دراز تھی !۔ فرمان اس کے سامنے آ بیٹھا اور اس کی گود میں چیکتے ہوئے سرخ گلاب رکھ دیئے !۔

ہاتھ تو نہیں زخمی کئے ؟" عائشہ نے پوچھا اور گلاب اٹھا کر سینے سے لگا لئے ۔ ہاتھوں کے زخم خشک ہو جائیں گے ۔ آپ ان کی پرواہ نہ کیجئے " اس کے لہجے میں بلا کا درد اور انتہائی حسرت تھی !۔ وہ اُسے دیکھتا رہا ۔ دیکھتا رہا ۔

عائشہ کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی جس کا مفہوم فرمان کی سمجھ میں نہیں آیا ۔ فیروزی رنگ کے لباس میں ملبوس وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی ، مگر اس کی آنکھوں میں اتنی تیز چمک تھی کہ فرمان کا دل دھڑکنے لگا !۔

کیا میں آ سکتا ہوں ؟" دفعتہ برآمدے کے سرے سے آواز آئی ۔

جی ؟ .... " فرمان چونک پڑا ۔" ہاں ۔ آیئے آیئے ۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا احمد تھا !۔ ہمیشہ کی طرح سفید شیروانی سفید پاجامہ پہنے ۔ اب سفید ٹوپی بھی سر پر نظر آ رہی تھی !۔ فرمان نے اس کے لئے کرسی کھسکائی اور یہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کے چہرے پر کون سے تاثرات تھے ؟ ۔

مگر وہ ہمیشہ کی طرح معصوم نظر آرہا تھا! ۔ حسین اور دلکش ۔ بھولا بھالا ۔ "

"خدا کا شکر ہے ۔" اس نے ہنس کر کہا: "میں آپ کو بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں اب کیسی طبیعت ہے ؟! ۔۔۔

وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے پیغام نے عائشہ کو نئی زندگی دی تھی ۔ اُس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب کبھی اپنی خواہش بھول کر بھی زبان پر نہیں لائے گا ! ۔

"اب تو میں اچھی ہوں ....." عائشہ نے کہا: "آپ نے سنا ۔ جلد ہی فرمان کی شادی ماریہ سے ہو جائے گی ۔ میری زندگی میں ! ۔"

"خدا کرے کہ ایسی خوشیاں آپ کو لاکھوں ملیں ! ۔" احمد نے خلوص سے کہا ۔

"خوشیوں میں اگر غرض پنہاں ہو تو وہ کیا چیز کہلائے گی ۔ احمد صاحب ؟ ۔" فرمان نے زہریلے لہجے میں پوچھا ۔ اُس نے اس کے خلوص کو منافقت سمجھا تھا ! ۔

"کس کی غرض ؟ ۔" وہ فرمان کا چہرہ تکنے لگا ! ۔

"فرمان ۔ یہ تم نے کیسی باتیں شروع کر دیں ؟ ۔" عائشہ نے گھبرا کر کہا اور اس کا ہاتھ دل پہ جا لگا ! ۔

"معلوم نہیں تم کیوں خفا ہو گئے ؟ ۔" احمد نے افسردہ لہجے میں کہا: "اچھا میں چلتا ہوں ۔ خدا آپ کو صحت و زندگی عطا فرمائے ! ۔" اور وہ پھر وہ برآمدے سے اتر کر چلا گیا ۔

عائشہ زرد ہو گئی تھی ۔ فرمان نے اُسے ایک نظر دیکھا اور پھر اس کی خشمگیں آنکھوں کی تاب نہ لا سکا ! ۔

اس کے بعد سے احمد نہیں آیا ۔ ویسے وہ روز ہی نرسنگ آرڈرلی سے اس کی حالت پوچھتا تھا! کبھی کبھی سوچی ہوئی آنکھوں اور کپکپاتے ہوئے لبوں سے ماریہ پیغام سناتی ! ۔ وہ روز بروز گرتی جا رہی تھی ! ۔ اب تو کرنل صفدر نے بھی

مایوسی کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے !۔

اُس دن صبح ہی سے سب لوگ بے انتہا پریشان تھے !۔ عائشہ کی طبیعت ڈھائی بجے ہی سے خراب ہو گئی تھی ۔ وہ رات فرمان نے اس کے پائنتی کھڑے کھڑے گزاری ۔ احمد برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔

فرمان نے بار بار سے جھانک کر نیچے دیکھا ۔ اور پھر عائشہ کو ۔ وہ ادھ کھلی آنکھوں سے اُسی کو دیکھ رہی تھی !۔

"فرمان !۔ اس کے کانپتے لبوں سے نکلا۔

" میں آپ کے پاس ہوں ۔" وہ اس کے قدموں میں جھک گیا۔

" تمھیں میری قسم ۔" وہ آہستہ سے بولی ۔" تم زندہ رہنے کی کوشش کرنا ۔ ممی کے دل پر تمھاری اپنی کا داغ بھی لگا ہے ۔ اُنھیں تسلیاں دیتے رہنا ۔ فرمان ..... میں نے تمھیں چاہا تھا ۔ دل کی تمام تر گہرائیوں سے ۔ مگر ..... دل نے ..... مجھ سے بے وفائی کی ۔ فرمان ..... ماریہ کا ہاتھ تھام لو ..... یہی میری آخری مسرت ہے ۔ باجی ..... شفو بھیا ۔ مجھے آپ کی شادی دیکھنے کی بہت آرزو تھی امی ..... بابا جان ۔ اور ۔ اور ۔ ممی ۔ آپ سب کہاں ہیں ؟"

صالحہ پاگل ہو رہی تھی : عاشی ۔ عاشی تم اچھی ہو جاؤ ۔ پھر تم سب کچھ دیکھ لینا ۔ عاشی ۔ آنکھیں کھولو ۔! دیکھو ہم سب تمھارے پاس ہیں ۔"

عائشہ ۔ عائشہ ۔" شفقت نے اسے گریہ آلود لہجے میں آواز دی ۔ اس نے یکبارگی آنکھیں کھول دیں ۔ عجیب سا رنگ اُس کے چہرے پر بکھر گیا ۔ پھر اس کی نظریں فرمان پر آکر رُک گئیں ۔

وہ دھیرے سے مسکرائی ۔

"ممی ۔ تم ۔ تم تو مجھ سے چھوٹے تھے !۔"

"آنکھیں نہ بند کیجیے۔ آنکھیں نہ بند کیجئے۔" وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

احمد پارٹیشن سے ٹیک لگائے کھڑا بے نور آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا!۔ اس کی آنسو بھری آنکھوں نے دیکھا

وہ حسین اور بیمار آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں!۔ اُن نرگسی آنکھوں پر گھنی پلکوں کی چلمن سدا کے لئے گر گئیں۔ اور معصوم مسکراہٹوں کے چراغ بجھ گئے

اس کے کانوں میں جگر خراش چیخوں کی آوازیں گونج رہی تھیں!۔

اس کی دھندلی آنکھوں کے سامنے کسی نے سفید شال سے اس کا چہرہ ڈھانپ دیا تھا!۔

کوئی اُسے سہارا دے کر باہر لا رہا تھا!۔ ہاتھوں پر۔ دھیرے دھیرے بے آواز — مگر اسٹریچر کی آواز کیسی خوفناک تھی!۔

پھر اسے نیا لباس پہنایا گیا — اور اس کی المناک زندگی کا سفر مٹی کے ڈھیر تک پہونچ کر ختم ہو گیا۔

کسی نے آہوں اور آنسوؤں کے ہجوم میں عائشہ کے گھر پر چراغ جلایا۔

"واپس آجائیے۔ واپس آجائیے۔ آپ جہاں کہیں ہوں۔"

کوئی بلک بلک کر رو رہا تھا!۔ مگر احمد تنہا تھا!۔

اس نے اپنے گرد و پیش دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ فرحان کا دھندلا سا ہیولا اُسے قبر کے پاس نظر آیا۔ وہی رو رہا تھا۔ سامنے موم کی شمع آنسو بہا رہی تھی!۔

اور ایک سسکی لے کر اُس نے اپنا سر عائشہ کے قدموں میں رکھ دیا

پھر ایک ہوا چلی اور چراغ گل ہو گیا۔

اندھیرے گورستان میں سوگوار ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں!!!

تمام شد